سن ۱۹۶۰ء کی
اردو
شاعری
سید حسین احسن

سٹار پاکٹ سیریز نمبر ۸۰
اردو شاعری
۱۹۶۰ء کا منتخب کلام
الحمد لائبریری
فیس بک گروپ۔ کتابیں پڑھیے
سید حسین احسن
Imagitor

ناشر
سٹار پبلیکیشنز
۲۷۱۵ - دریا گنج - دہلی ۶
قیمت صرف ایک روپیہ
سول ایجنٹس :-
مرتب: انور کمال حسینی
پنجابی پستک بھنڈار
دریبہ کلاں - دہلی ۶
S-80 URDU SHAYRI
Re 1/=

ترتیب

عرضِ مرتّب

ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب میں صرف سنہ ۱۹۶۰ء کا ہی کلام شامل کیا جائے پھر بھی ممکن ہے کہ کچھ چیزیں سنہ ۱۹۶۰ء سے پہلے شائع ہونے کے بعد سنہ ۶۰ء میں مکرر چھپی ہوں اور اس وجہ سے اس انتخاب میں شامل کر لی گئی ہوں۔

اس انتخاب کے لئے جہاں مجھے ان تمام شعرا کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی چیزیں شامل کی گئی ہیں وہاں میں جناب اجمل اجملی، مخمور سعیدی اور راقم صدیقی کا بھی ممنون ہوں۔ جنہوں نے اس انتخاب کی تیاری میں مجھے تعاون دیا۔

انور کمال حسینی

جگر مرادآبادی

محبت کا بالآخر یہ فیض بیتابانہ کام آیا
نگاہِ شرمگیں اٹھی، سلام آیا پیام آیا

نہ جانے آج کس دھن میں زباں پر کس کا نام آیا
فضا نے پھول برسائے، ستاروں کا سلام آیا

ادب اے گردشِ دوراں کہ پھر گردش میں جام آیا
سنبھل اے عہدِ تاریکی کہ وقتِ انتقام آیا

جہادِ زندگی میں جب کوئی نازک مقام آیا
جنوں ہی نے قیادت کی، خلوصِ غم ہی کام آیا

نئی تخریب لازم ہے نئی تعمیر کی خاطر
ہوا کیا؟ اگر کچھ گر گئیں دیواریں تو تھام آیا

سنبھل کر یوں تو ہم گذرے کسی کی راہ میں لیکن
کچھ ایسے بھی مقام آئے کہ گر پڑنا ہی کام آیا

مجھے شکوہ نہیں ساقی سے اپنی تشنہ کامی کا
مری قسمت میں دل آیا ترے حصے میں جام آیا

اٹھا تعظیم کو ساقی، جھکے شیشے، بڑھے ساغر
نہ جانے آخرِ شب کون یہ تشنہ کام آیا

اندھیرے دل سے اجالے پھوٹ نکلے دل میں یہ کہتا
مرا افسوں خرام آیا، مرا ماہِ تمام آیا

نکل آیا جگر جب میکدے میں شور یہ اٹھا
وہ رندِ دل بہ یار و مے بہ جام و تشنہ کام آیا

(آج کل دہلی)

فراق گورکھپوری

اس زلف کی یاد جب آنے لگی — اک ناگن سی لہرانے لگی

جب ذکر مرا محفل میں چھڑا — کیوں آنکھ تری شرمانے لگی

کیا موجِ صبا تھی مستی نظر — کیوں زلف تری بل کھانے لگی

محفل میں تری ایک ایک ادا — کچھ ساغر سے چھلکانے لگی

کچھ نشہ مجھے بہکانے لگا — کچھ تری نظر بہکانے لگی

یارب یہ چلی گیتی کیسی ہوا — کیوں دل کی کلی مرجھانے لگی

شامِ وعدہ کچھ رات گئے — تاروں کو تری یاد آنے لگی

سازِ دل نے آنکھیں جھپکائیں — نغموں کو مرے نیند آنے لگی

جب راہِ زندگی کاٹ چکے — ہر منزل کی یاد آنے لگی

کیا اُن زلفوں کو دیکھ لیا — کیوں موجِ صبا تھرّانے لگی

کیوں بیٹھے بٹھائے یاد تری — ترسانے لگی تڑپانے لگی

تارے ٹوٹے یا آنکھ کوئی — کچھ موتی سے برسانے لگی

تہذیب اُڑی ہے دھواں بن کر — صدیوں کی سعی ٹھکانے لگی
کوچہ کوچہ رفتہ رفتہ — وہ چال قیامت ڈھانے لگی
کیا بات ہوئی؟ یہ آنکھ تری — کیوں لاکھوں قسمیں کھانے لگی
اب میری نگاہِ شوق ترے — رخساروں کے پھول کھلانے لگی
پھر رات گئے بزمِ انجم — رُوداد نئی دُہرانے لگی
پھر یاد تری ہر سینے کے — گلزاروں کو مہکانے لگی
بے گور و کفن جنگل میں یہ لاش — دیوانے کی خاک ٹھکانے لگی
وہ صبح کی دیوی زیرِ شفق — گھونگھٹ سی ذرا سرکانے لگی
اس وقت فراقؔ ہوئی یہ غزل — جب تاروں کو نیند آنے لگی

(شمع دہلی)

گیت

جوشؔ ملیح آبادی

داتا ایسی رُت بھی آئے چھائے گھٹا گھنگھور
داتا آئے گھٹا گھنگھور

آئے سبھا میں گوکل والی — بھکی مہکی بھولی بھالی
جیسے ہلتی کومل ڈالی — مکھڑا گورا زلفیں کالی
گورا مکھڑا ایسا چمکے جیسے بن میں بھور
داتا ایسی رُت بھی آئے چھائے گھٹا گھن گھور

بانکے گوری [illegible] — انگڑائی لے چولی مسکے
دہری ہو جائے ہنس ہنس کے — پلٹے ناگن جیسے ڈس کے
مستی سارے رنگ سے ٹپکے چھلکے ہر اک پور
داتا ایسی رُت بھی آئے چھائے گھٹا گھن گھور —

کوئل کوکے دادر بولے — ہُن برسائے موتی رولے
کانوں میں رس بوندیں گھولے — سُن رتا کا گھونگھٹ کھولے

من میں گھومے بارہ ماسہ تن میں جھومے شور
داتا ایسی رُت بھی آئے چھائے گھٹا گھن گھور

لچکے جھومے گائے جوانی — لے کی دیوی سُر کی رانی
کھن کھن بولیں کنگن دھانی — رم جھم رم جھم برسے پانی
چھن چھن بولے ہلکی پائل بن بن گونجیں مور
داتا ایسی رُت بھی آئے چھائے گھٹا گھن گھور

جو دارو کو شرماتے ہیں — مستی سے جن کے ناطے ہیں
جو شیشوں کو ورکاتے ہیں — مدھ شالوں پر چھا جاتے ہیں
ڈوبیں میرے ہردے میں بھی وہ نیناچت چور
داتا ایسی رُت بھی آئے چھائے گھٹا گھن گھور

گال بھبھوکا جیسے کوئلے — جن کے آگے سورج سہلے
آنکھیں ناچیں ہو کے ہولے — جب منہ دھوئے پانی کھولے
جن کی لالی سے ڈھ جائے کندن کا بھی زور
داتا ایسی رُت بھی آئے چھائے گھٹا گھن گھور

کوئی البیلی مدھ ماتی — آنکھیں ملتی مکھ سہلاتی
نیند اوڑھے جھینپے کھاتی — دھیمے مڑتی بانہیں جاتی
تڑپے ہائے رس برساتی، جمنا جی کے اور
داتا ایسی رُت بھی آئے چھائے گھٹا گھن گھور

مدرا سے ہر کھٹرا دہکے — مدری لودے بندیا چمکے
پروا گونجے بادل گھنے — بادل میں یوں بجلی چمکے
کالی ساری میں لہرائے جیسے جھل جھل کور، داتا ایسی رت بھی آئے چھائے گھٹا گھن گھور

(تنہا ددر کراچی)

حفیظ جالندھری

سمجھے نہیں مزاج ہوائے چمن کئی
اب تک ہیں محوِ جلوۂ سرو و سمن کئی

جو آگ کشتۂ گل سے اٹھی اور نہ بجھ سکی
اس آگ نے بھی پھونک دیئے ہیں چمن کئی

محشر میں نام تیرے شہیدوں کا آ گیا
اٹھے صلائے شوق پہ رعنا کفن کئی

مخصوص میرے ساقیِ مخلوق کا ہے کرم
کب سے ترس رہے ہیں سرِ انجمن کئی

کنجِ فراق سے تری بزمِ خیال تک
تیرے غریبِ شہر کے بھی ہیں وطن کئی

خالی رہا نہ پیشۂ غم اہلِ درد سے
ہر کوہسار میں ہیں ابھی کوہکن کئی

جو آشیاں خزاں میں لٹے ان کا ذکر کیا
ہوں گے ابھی تو نذرِ بہارِ چمن کئی

رستے میں جو ملے تھے ہم ان سے نبٹ چکے
نکلیں گے کارواں سے ابھی راہزن کئی

کرتا ہے کون ہم سے وفا دیکھنا ہے یہ
سیکھیں گے یوں تو ہم سے وفا کا چلن کئی

رنج و محن کی تہ کو نہ پہنچا کوئی حفیظ
کرتے رہے تلافیٔ رنج و محن کئی

(ماہِ نو کراچی)

ساغر نظامی

کم آرزو سے لالہ رُخاں ہونے نہ پائے — ویراں حریمِ دل و جاں ہونے نہ پائے

طوفانِ الم سیلِ رواں ہونے نہ پائے — دل خوں ہو مگر شورِ فغاں ہونے نہ پائے

بے کیفیٔ دل راز نہاں ہونے نہ پائے — لُٹ جائے مگر احساسِ زیاں ہونے نہ پائے

گر غلطیٔ گُل بدگماں ہونے نہ پائے — مستی پہ حقیقت کا گماں ہونے نہ پائے

ہر تہ میں شبِ ماہ سے پھول دریچے — گر بیعتِ صد ماہ وشاں ہونے نہ پائے

بن جائے یہ فردوسِ جہاں بابِ جہنم — گر عمرِ دو گُل بدناں ہونے نہ پائے

اک پیاس سی چھا جائے زمین و زماں پہ — گر مرحمتِ پیرِ مغاں ہونے نہ پائے

جس نے ترے سینے کو کیا جنتِ آغوش — یہ پھول کبھی نذرِ خزاں ہونے نہ پائے

پھولوں سے لدی شاخ بھی پرچمِ مستی — یہ شاخ بھی زنجیرِ گراں ہونے نہ پائے

شعلوں پہ بھی پھولوں کی لطافت کا گماں ہے — ہر سمت لگے آگ دھواں ہونے نہ پائے

ہر خار پہ گُل کاریٔ تازہ ہو لہو سے — صحرا مرا بے رنگ و نشاں ہونے نہ پائے

اے موجِ صبا مستیٔ موسم سے خبردار — اک پھول کی پتّی کا زیاں ہونے نہ پائے

جس دل پہ زمانے کی جفا بیت گئی ہے — وہ دل ابھی بے تابِ فغاں ہونے نہ پائے
جینے کے لئے چاہیئے پتّھر کا کلیجہ — دل کارگہِ شیشہ گراں ہونے نہ پائے
رُسوائی ہے آنکھوں سے لہُو بن کے ٹپکنا — آنسو تو وہی ہے جو رواں ہونے نہ پائے
نفرت ہی پہ موقوف نہیں ظرف تو یہ ہے — آنکھوں سے محبّت بھی عیاں ہونے نہ پائے
جو لفظ ہے افسانہ و افسوں کا خلاصہ — افسوس وہی لفظ بیاں ہونے نہ پائے
ناموسِ حوادث کی قسم وقت کا صدقہ — ماضی کا کوئی زخم عیاں ہونے نہ پائے

ہر دَور کے بعد ایک نیا دَور ہو ساغرؔ
توہینِ جہانِ گُزراں ہونے نہ پائے

(بیسویں صدی دہلی)
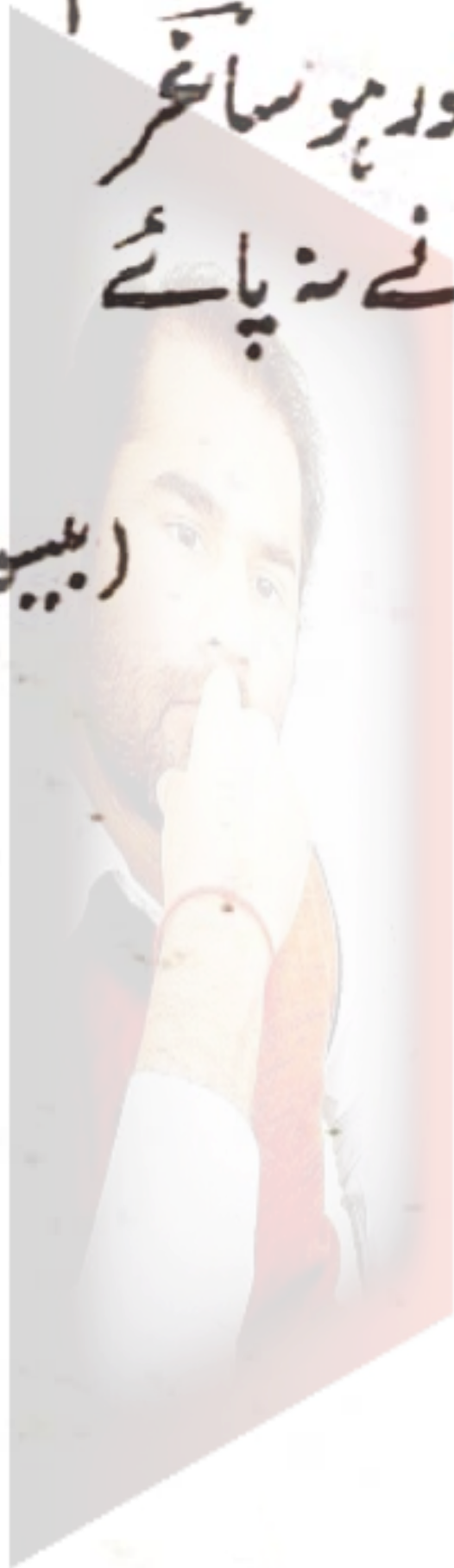
فیض احمد فیض

قطعات

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دنوں
کھلتی ہے صبح، گُل کی طرح رنگ و بُو سے پُر
ویراں ہیں جام، پاس کرو کچھ بہار کا
دل آرزو سے پُر کرو، آنکھیں لہو سے پُر

آگئی فصلِ سکوں، چاک گریباں والو
سِل گئے ہونٹ، کوئی زخم سِلے یا نہ سِلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کِھل گئے زخم، کوئی پھول کِھلے یا نہ کِھلے

(افکار کراچی)

اسرار الحق مجاز

کیفِ سحر

یہ زمیں بارگہِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھی
صبح کے واہمے میں وہ کاہکشاں ہے کہ جو تھی

ہر نظر جلوہ گہِ نازِ بتاں ہے کہ جو تھی
ہر سحر نور کا اک سیلِ رواں ہے کہ جو تھی

شام شرمندۂ آوازِ اذاں ہے کہ جو تھی
آہ اب بھی بحدیثِ دگراں ہے کہ جو تھی

سانس اک زمزمۂ خندۂ تپاں ہے کہ جو تھی
خاکِ دل شہرۂ شہنازِ جواں ہے کہ جو تھی

وہ جبیں آج بھی ہے مہرِ درخشانِ افق
زلف اک سلسلۂ ابرِ رواں ہے کہ جو تھی

عشق بیگانہ سہی شوق اک افسانہ سہی
آنکھ اب بھی بھر آسا نگراں ہے کہ جو تھی

کوہ کے قلب میں محفوظ ہے تیشے کی صدا
جوئے شیر آج بھی فریاد کناں ہے کہ جو تھی

برق و رفرف نہ کریں خاک نشینوں کو سلام
یہ زمیں کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھی

صاف فارانِ تمنا سے یہ اعلان کرو
آج بھی آتشِ سیال جواں ہے کہ جو تھی

نالہ کش آج بھی ہے قلزمِ افرنگ مجاز
پھر سلیمانیِ آتش نفساں ہے کہ جو تھی

(افکار کراچی)

ساحر لدھیانوی

تیری نظریں

تیری نظروں کو محبت کی تمنا نہ سہی — تیری نظریں مری ہمراز تو بن سکتی ہیں
چار دن کے لئے تکلیفِ مروّت کر کے — اِک نئے درد کا آغاز تو بن سکتی ہیں

یاد

جہاں جہاں تیری نغموں کی اوس ٹپکی تھی — وہاں وہاں سے ابھی تک غبار اٹھتا ہے
جہاں جہاں تیری نظروں کے پھول بکھرے تھے — وہاں وہاں دلِ وحشی پکار اٹھتا ہے

واقفِ اسرار

وجہِ بے رنگیِ گلزار کہوں تو کیا ہو؟ — کون ہے کتنا گنہگار کہوں تو کیا ہو؟
تم نے جو بات سرِ بزم نہ سننا چاہی — مَیں وہی بات سرِ دار کہوں تو کیا ہو؟

ہم

نہ منہ چھپا کے جئے ہم نہ سر جھکا کے جئے — ستمگروں کی نظر سے نظر ملا کے جئے
اب ایک رات اگر کم جئے تو حیرت کیا؟ — ہم اُن کے ساتھ تھے، جو مشعلیں جلا کے جئے

(شمع دہلی)

احسان دانش

جس کا دل زندہ نہیں جس میں خودی ہوتی نہیں
زندگی اُس کی حقیقی زندگی ہوتی نہیں

روز چھڑتا ہے محبت میں نیا اِک مسئلہ
گفتگو اُن کی ہماری آخری ہوتی نہیں

ہے تو گستاخی مگر مجھ کو جنوں درکار ہے
اب ترے جلوؤں سے کچھ دلبستگی ہوتی نہیں

ہم قلندر اک جُدا رکھتے ہیں اسلوبِ نیاز
ہم سے یہ ہرگز عوامی بندگی ہوتی نہیں

ہو نہ جب تک چشمِ ساقی کا اثر جزوِ شراب
لغزشیں ہی لغزشیں ہیں بیخودی ہوتی نہیں

رفتہ رفتہ ہو گئی دُنیا حجابِ حسن و عشق
اب وہ ملتے ہیں تو ان سے بات بھی ہوتی نہیں

سب سے پہلے باغ میں جس کو کھلاتی ہے بہار
خاک سے اُگتی ہے چنگاری کلی ہوتی نہیں

یہ تنا سب کیا ہے دانش ایک قطرہ ایک بحر
شاعری سب کچھ سہی پیغمبری ہوتی نہیں

(نیا پیام لاہور)
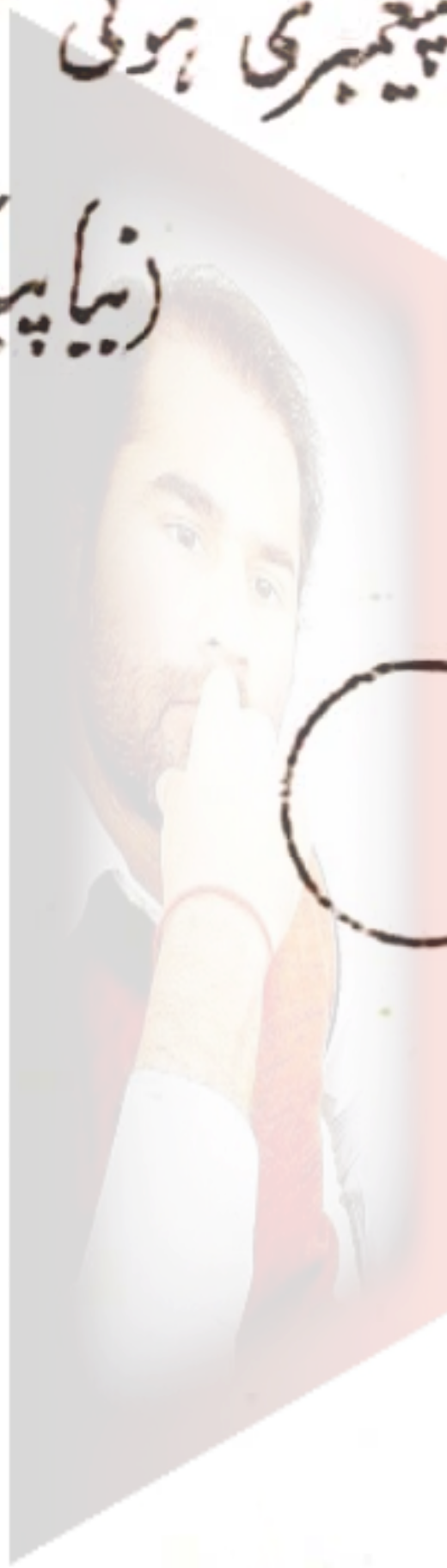
سکندر علی وجد

دو آتشہ

پھول پر جب کرن تھرتھرائی — وہ نشیلی نظر یاد آئی

ان کی آمد کا پیغام سن کر — بڑھ گیا اور دردِ جدائی

دل نشیں، دل کشا، دلربا ہے — ان کے لہجے کی غم آشنائی

میں کہاں اور کہاں بزمِ جاناں — ان کے جلووں نے کی رہنمائی

مطمئن ہیں اسیرانِ کاکل — ہوگئی بندِ غم سے رہائی

حسن تھا التفاتِ مجسم — عمر ہی کہہ گئی سب بے وفائی

وجد کوئی گلستاں میں آیا
یا نسیمِ سحر سرسرائی

کشتِ دل جب ذرا لہلہائی — ہر تمنا دُلہن بن کے آئی

ہم رہے سُرخ رُو مے کدے میں — جام سے مے چھلکنے نہ پائی

وقت کی راہ میں عشق تنہا — حُسن کے ساتھ ساری خُدائی

دولتِ تاجدارانِ اُلفت — بے خودی، بے غمی، بے نوائی

اِک نگاہِ کرم کی بدولت — بزمِ دل دیر تک جگمگائی

رات بھر خون روئے ستارے — تب سہانی سحر مسکرائی

گل بدامن ہیں رنگین جلوے
وجد کر لو نظر آزمائی

(شمع دہلی)

شکیل بدایونی

حُسنِ نظر

غم سے کہاں اے عشق مفر ہے — رات کٹی تو صبح کا ڈر ہے
ترکِ وفا کو مُدّت گذری — آج بھی لیکن دِل پہ اثر ہے
آئینے میں جو دیکھ رہے ہیں — یہ بھی ہمارا حُسنِ نظر ہے
غم کو خوشی کی صورت بخشی — اس کا بھی سہرا آپ کے سر ہے
لاکھ ہیں اُن کے جلوے جلوے — میری نظر پھر میری نظر ہے
تم ہی سمجھ لو ـــــ تم ہو مسیحا! — مَیں کیا جانوں درد کدھر ہے
آج بہ فیضِ نکتہ شناساں! — تنگ ادب کی راہگذر ہے

پھر بھی شکیل اس دَور میں پیارے
صاحبِ فن ہے اہلِ ہُنر ہے

(صبحِ اُمید بمبئی)

مجروح سلطان پوری

وہ جس پہ تمہیں شمعِ سرِ رہ کا گماں ہے
وہ شعلۂ آوارہ ہماری ہی زباں ہے

اب ہاتھ ہمارے ہے عناں رخشِ جنوں کی
اب سر پہ ہمارے کُلہِ سنگِ بتاں ہے

کیسے نہ یہیں جل بجھے پروانۂ منزل
یہ جشنِ سرِ رہ تو چراغوں کا زیاں ہے

بس پھیر کے منہ خارِ قدم کھینچ رہے تھے
دیکھا تو یہاں قافلۂ ہم سفراں ہے

کام آئے بہت لوگ سرِ مقتلِ ظلمات
اے روشنیٔ کوچۂ دلدار کہاں ہے

اے اہلِ جنوں ہم کو ہے شغلِ گریباں
پیوند ہی کافی ہے اگر جامہ گراں ہے

مجروح کہاں سے گہرِ گندم و جو لائیں
اپنی تو گرہ میں یہی چشمِ نگراں ہے

(افکار کرا

احمد ندیم قاسمی

(ایک ذاتی حادثے کی زد میں آ کر یہ اشعار کہے گئے)

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے

کوہِ آلام سے دیکھوں تو مجھے
دشتِ آغوشِ فنا لگتا ہے

سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے خفا لگتا ہے

موسمِ گل میں سرِ شاخِ گلاب
شعلہ بھڑکے تو بجا لگتا ہے

مسکراتا ہے جو اس عالم میں
بخدا! مجھ کو خدا لگتا ہے

اتنا مانوس ہوں سنّاٹے سے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے

ان سے مل کر بھی نہ کافور ہوا
درد یہ سب سے جُدا لگتا ہے

نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شکر کرتا ہوں گلہ لگتا ہے

اس قدر تند ہے رفتارِ حیات
وقت بھی رشتہ بپا لگتا ہے

انجم و ماہ کا کیا ذکر ندیم!
مہر محتاجِ ضیا لگتا ہے

(افکار کراچی)

نیاز حیدر

الحمد لائبریری

زندہ باد اے حریت

(۱)

مری جاں !

آج پہلی بار میں خوش ہو سکا تھا'

آج سے بارہ برس پہلے !

"وطن کی سرزمیں چلا رہی ہے

کہ دو ٹکڑوں میں بانٹی جا رہی ہے

وہ سیتا ہو کہ مریم ہو کہ زینب

جلوسوں میں چلو ننگے بدن سب

یہی ہے حکم شیخ و برہمن کا

یہ ہے فرمان ہر اک راہزن کا

۴

یہ فکر قاتلانِ پیشہ ور ہے
یہ دینِ اہلِ باطل اہلِ شر ہے
چھرے چاقو کی جے جے کار گونجے
تبر تلوار کی جھنکار گونجے"

خدا بھگوان ہوں گے آسماں پر
یہ بندے کٹ رہے ہیں کیوں یہاں پر

مری ماضی کی یادیں!
کیا ابھی تک پا بجولاں ہیں؟
ابھی تک چند ایسی یادگاریں
مجسم بت بنی بے حس، مگر زندہ!
وہ میری آرزوئیں زندگی کی

——— میری تصویریں ———
فنا ہونے نہ دونگا میں جنہیں برباد ہو کر بھی

(۲)

مرا دل ———

آدمیت پر یقین و اعتماد و فخر کا پربت ہے
وندھیاچل ہمالہ ہے

مرا دل ———

سیل خوں میں غرق ہو کر

آفتاب صبحِ نو کی طرح
امن و آشتی کی روشنی
دُنیا کو بہتر زندگی کا نور دینے کے لئے
خونیں شفق کی سطح سے اُبھرا!

بہادر قوم نے میری
فرنگی ڈاکوؤں کی لوٹ سے ویران گلشن کو
نئے خوابوں، جوانی، عزمِ نو کے تازہ پھولوں سے
بصد حسن و جمالِ نو سجایا ہے!
یہ شہرِ عظمتِ ہندوستان، دہلی!
نشانِ حریت کی چھاؤں میں اب قائم و دائم رہے
قائم و دائم رہے محنت کشوں کا اتحاد!
زندہ باد اے حریت اے زندگی پائندہ باد!
لا مجھے وہ جام دے!
انعام دے!

آج پہلی بار میں خوش ہو سکا تھا
آج سے بارہ برس پہلے!

(عوامی دَور دہلی)

سردار جعفری

ایک بات

اس پہ پھُولے ہو کہ ہر دل کچل ڈالا ہے
اس پہ پھُولے ہو کہ ہر گُل کو مسل ڈالا ہے
اور ہر گوشۂ گلزار میں سناٹا ہے
کسی سینے میں مگر ایک فغاں تو ہوگی
آج وہ کچھ نہ سہی کل کو جواں تو ہوگی
وہ جواں ہو کے اگر شعلۂ جوالا بنی
وہ جواں ہو کے اگر آتشِ صد سالہ بنی
خود ہی سوچو کہ ستم گاروں پہ کیا گذرے گی

(عوامی دَور دہلی)

ماہرالقادری

راہ و منزل

لوگ ایک ایک بوند کو ترسے
اب کے بادل کچھ اس طرح برسے

جانے کیا انتقام لے دنیا
مسکراتا نہیں ہوں اس ڈر سے

اس مسافر کی راہ و منزل کیا
بے ارادہ جو چل پڑے گھر سے

دل کی دھڑکن کی یہ خوش اندیشی
جیسے گذرے ہیں وہ برابر سے

ضبطِ گریہ کی کشمکش، توبہ
کتنے طوفاں گذر گئے سر سے

نام لیتا ہوں ان کا اے ماہر
کلیاں کر کے آبِ کوثر سے

(صبحِ امید بمبئی)

مخدوم محی الدین

یہ احساس کی رات

مجھے ڈر ہے کہ کہیں سرد نہ ہو جائے یہ احساس کی رات
نرغۂ طوفانِ حوادث کے، ہوس کی یلغار
یہ دھماکے، یہ بگولے، — سرِ راہ
جسم کا جان کا پیمانِ وفا کیا ہوگا؟
تیرا کیا ہوگا مرے تارِ نفس
تیرا کیا ہوگا اے مضرابِ جنوں
یہ دہکتے ہوئے رخسار
یہ مہکتے ہوئے لب
یہ دھڑکتا ہوا دل

شفق زیست کی پیشانی کا رنگیں قشقہ
کیا ہوگا۔

اُڑ نہ جائے کہیں یہ رنگِ جبیں
مِٹ نہ جائے کہیں یہ نقشِ وفا
چُپ نہ ہو جائے یہ بجتا ہوا ساز
شمعیں اب کون جلائے گا سرِ شام گذرگاہوں پر
دہر میں لُطف و عطا کچھ بھی نہیں
دہر میں مہر و وفا کچھ بھی نہیں
سجدہ کچھ بھی نہیں نقشِ کفِ پا کچھ بھی نہیں
میرے دل اور دھڑک
شاخِ گُل
اور مہک اور مہک اور مہک

(صبا حیدرآباد)

ظہیر کاشمیری

شاہدہ

کسی سنولائی ہوئی شام کی تنہائی میں
دو سر کتے ہوئے سایوں میں ہوئی سرگوشی
بات چھوٹی تھی — مگر پھیل کے افسانہ بنی!

میں نے اکثر یہی سوچا، تیرا ہموار بدن
نقرۂ ناب کا ترشا ہوا ٹکڑا ہو گا
دودیا، سرد — حرارت سے تہی
جس پہ طاری ہو خود اپنے ہی تصوّر کا جمود
کوئی اعجازِ پرستش جسے چونکا نہ سکے

تو مگر ــــ پھول کی پتی سے سبک تر نکلی
اوس کے لمس سے جو آپ ہی جھک جاتی ہو
اک ہلورہ بھی جسے چوٹ لگا سکتا ہو
تو مگر ــــ خواب محبت تھی فرشتوں نے جسے
بیٹھ کر چاند ستاروں میں بُنا صدیوں تک
اپنے بلور کے ایوان سجانے کے لیے
دمِ گفتار ــ تیرے ہونٹوں سے رستی ہوئی بات
جیسے یاقوت کی سِل چیر کے جھرنا پھوٹے
اور گیتوں کے بہاؤ میں مئے طرب کو لیے
چھوڑ آئے کسی رومان بھری وادی میں
تیری شب تاب جوانی کی ضیا نے اکثر
ہالۂ نور مرے گرد کیا ہے تعمیر
اور میں حجلۂ تنویر میں پہروں بیٹھا
تیرے مانوس تنفس کی صدا سنتا رہا

ابھی کچھ اور بھی راتیں ہیں پسِ پردۂ غیب
ابھی کچھ اور بھی نغمے ہیں پسِ پردۂ ساز
کتنی راتوں، کتنے نغموں سے گزرنا ہوگا
دیکھ! وہ چاند کی چوٹی کا چمکتا مینار
اسی مینار میں دونوں کو پہنچنا ہوگا

(سومیہ، لاہور)

ان نثار اختر

احساس

میں کوئی شعر نہ بھولے سے کہوں گا تجھ پر
فائدہ کیا جو مکمل تری تحسین نہ ہو
کیسے الفاظ کے سانچے میں ڈھلے گا یہ جمال
سوچتا ہوں کہ ترے حسن کی توہین نہ ہو

ہر مصور نے ترا نقش بنایا لیکن
کوئی بھی نقش ترا عکسِ بدن بن نہ سکا
لب و رخسار میں کیا کیا نہ حسیں رنگ بھرے
پر بنائے ہوئے پھولوں سے چمن بن نہ سکا

ہر صنم ساز نے مرمر سے تراشا تجھ کو
پر یہ پگھلی ہوئی رفتار کہاں سے لاتا
تیرے پیروں میں تو پازیب پہنا دی لیکن
تیری پازیب کی جھنکار کہاں سے لاتا

شاعروں نے تجھے تمثیل میں لانا چاہا
ایک بھی شعر نہ موزوں تری تصویر بنا
تیری جیسی کوئی شے ہو تو کوئی بات بنے
زلف کا ذکر بھی الفاظ کی زنجیر بنا

تجھ کو کوئی پردہ نہیں چھپا سکتا
کسی تخیل میں یہ جاں کہاں سے آئے
ایک ہلکی سی جھلک تیری مقید کر لے
کوئی بھی فن ہو یہ امکان کہاں سے آئے

تیرے شایاں کوئی پیرایۂ اظہار نہیں
صرف وجدان میں اک رنگ سا بھر سکتی ہے
میں نے سوچا ہے تو محسوس کیا ہے اتنا
تو نگاہوں سے فقط دل میں اتر سکتی ہے

(شجیع امید)

وامق جونپوری

تین رُخ

عرصۂ شوق کی وسعتیں دیکھ کر
زندگی کس قدر مختصر ہو گئی

اور تو کچھ نہ یاد ہے بیاں کر سکیں
زندگی تیز سے تیز تر ہو گئی

پہنچے جس وقت منزل پہ تب یہ کھلا
زندگی راستوں میں بسر ہو گئی

(عوامی دور دہلی)

سید محمد جعفری

ایبسٹریکٹ آرٹ

ایبسٹریکٹ[1] آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے ۔۔۔ کی تھی از راہِ مروت بھی ستائش میں نے
آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں ۔۔۔ لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں
صرف کہہ سکتا ہوں اتنا ہی، وہ تصویریں تھیں ۔۔۔ یار کی زلف کو سلجھانے کی تدبیریں تھیں

ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی ۔۔۔ بھینس کے جسم پر اک اونٹ کی سی گردن تھی
اک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں ۔۔۔ ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں
نقشِ محبوب مصوّر نے سجا رکھا تھا ۔۔۔ مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا
یہ سمجھنے کو کہ یہ آرٹ کی کیا منزل ہے ۔۔۔ ایک نقاد سے پوچھا جو بڑا قابل ہے

---

[1] ABSTRACT ART

سبزۂ خط میں وہ کہنے لگا رعنائی ہے
میں یہی سمجھا کہ ناقص مری بینائی ہے

بولی تصویر جو میں نے اُسے اُلٹا پلٹا
"میں وہ جامہ ہوں کہ جبکا نہیں سیدھا اُلٹا"

اس کو نقاد نے تو اِک چشمۂ حیواں سمجھا
میں اُسے حضرتِ مجنوں کا گریباں سمجھا

دیر تک بحث رہی مجھ میں اور اسمیں جاری
تب یہ ثابت ہوا ہوتی ہے یہ اک بیماری

ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورقِ صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے

ٹیڑھی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن

بولا نقاد جو یہ آرٹ ہے تجریدی ہے
آرٹ کا آرٹ ہے تنقیدی کی تنقیدی ہے

تھا کیوبزم میں کاغذ یہ جو آتا تھا نظر
مجھ کو اینٹیں نظر آتی تھیں اُسے حسنِ بشر

بولا نقاد نظر آتے یہی کچھ ہیں ہم
خُلد میں حضرتِ آدم جو نہ کھاتے گندم

ایبسٹریکٹ آرٹ بہر طور نرالا نکلا
"قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا"

وہ خد و خال کہ ثانی نہیں جنکا کوئی آج
بات یہ بھی ہے کہ ملتا نہیں لوگوں کا مزاج

اس کو کیوبزم کا آزار کہا کرتے ہیں
اس کے خالق جو ہیں بیمار رہا کرتے ہیں

ایک تصویر جو دیکھی تو یہ صورت نکلی
جس کو سمجھا تھا انناس وہ عورت نکلی

ایبسٹریکٹ آرٹ کی اس حد پہ دیکھی بے لباس
"تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس"

اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجوں سے لپٹ جاتے تھے

ایبسٹریکٹ آرٹ کا اک یہ بھی نمونہ دیکھا
فریم کاغذ پہ تھا کاغذ جو تھا سو نہ دیکھا

وہ ہمیں کیسے نظر آتے جو مقسوم نہیں ”لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں معلوم نہیں“
ڈر سے نقادوں کے اس آرٹ کو یوں کہتے ہیں ہم ”شاید ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم“

الغرض جائزہ لے کر یہ کیا ہے انصاف آج تک کر نہ سکا اپنی خطا خود میں معاف
میں نے یہ کام کیا سخت سزا پانے کا یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا
کیسی تصویر بنائی مرے بہکانے کو
اب تو دیوانے بھی آنے لگے سمجھانے کو

(آج کل دہلی)

…م ربانی تاباں

دلِ تباہ نے اک تازہ زندگی پائی
تمہیں چراغ ملا۔ ہم نے روشنی پائی

ترے خیال سے فرصت اگر کبھی پائی
بھری بھری سی یہ دنیا تہی تہی پائی

ستم بھی تیرے تغافل کو سازگار آیا
وفا کی داد بھی ہم نے کبھی کبھی پائی

نکھر گئے ہیں پسینے میں بھیگ کر عارض
گلوں نے اور بھی شبنم سے تازگی پائی

سحر سے مل تو گیا سلسلہ اُجالے کا
حیات شمع نے کہنے کو عارضی پائی

کبھی جو یادِ خراباتِ آرزو آیا
غمِ حیات کی تلخی میں کچھ کمی پائی

درِ حرم سے تو جو کچھ ملا ملا تاباں
درِ مغاں سے بھی پائی تو تشنگی پائی

(افکار کراچی)

مسعود اختر جمال

○

سمجھے تجھے بے خبر جنہیں ہشیار وہ بھی ہیں
ساقی اس انجمن کے نگہدار وہ بھی ہیں

جن کے لہو سے دامنِ صحرا ہے لالہ رنگ
اے نرگسِ چمن ترے بیمار وہ بھی ہیں

اربابِ میکدہ سے عبث ضد ہے شیخ کو
خوش فکر و خوش مزاج و خوش اطوار وہ بھی ہیں

لعلِ گراں بہا کو سمجھے ہیں جو خزف
یارب متاعِ دل کے خریدار وہ بھی ہیں

تشنہ لبوں پہ تنگ نہ کر عرصۂ حیات
ساقی ترے کرم کے سزاوار وہ بھی ہیں

کچھ اختیار ہی نہیں اس جبرِ عشق پر
مجبور ہم ادھر ہیں تو ناچار وہ بھی ہیں

با چشمِ نم وہ دیکھ رہے ہیں مری طرف
حیرت سے آج نقش بہ دیوار وہ بھی ہیں

چپ ہیں وہ آج سن کے مری داستانِ غم
انصاف کیا کریں کہ خطاوار وہ بھی ہیں

توفیق جن کو معصیتِ عشق کی نہیں
اے رحمتِ تمام گنہگار وہ بھی ہیں

خود اپنے حال کی جنہیں کچھ بھی خبر نہیں
دیر و حرم کے محرمِ اسرار وہ بھی ہیں

بدتر ہیں دشمنوں سے کچھ ایسے بھی ہیں رفیق
جن کو شعورِ غم نہیں غمخوار وہ بھی ہیں

سمجھے ہیں جو حیات کو خوابِ گراں جمال
ضد ہے انہیں کہ شاعرِ بیدار وہ بھی ہیں

(افکار، کراچی)

نشور واحدی

غم خاموش جو با اشک چکاں رکھتا ہوں
ایک ٹھہرے ہوئے دریا کو رواں رکھتا ہوں

شوق تازہ ہو کہ ہو حسرتِ بالیدہ کوئی!
کچھ نہ کچھ سلسلۂ آہ و فغاں رکھتا ہوں

کچھ جھجکتی ہوئی نظریں ہیں خریدارِ جمیل
میں بھی بازار میں ستاروں کی دکاں رکھتا ہوں

منتظر ہیں حرم و دیر کے گوشے یعنی
میں نے جو شمع جلائی ہے کہاں رکھتا ہوں

غیر کے ہاتھوں میں آزادیٔ گلشن کا چراغ
میں فقط مردہ چراغوں کا دھواں رکھتا ہوں

انقلابات و عزائم کے سنورنے کے لئے
ایک آئینہ پس لفظ و بیاں رکھتا ہوں

میری دنیا میں نہ کعبہ ہے نہ بتخانہ نشور
دل کے گوشے میں مگر دیرِ مغاں رکھتا ہوں

(شعور حیدرآباد)

نظر حیدر آبادی

جب سے ہیں میرے رفیق الم روزگار کے
ہیں اجنبی سے اپنے لئے دن بہار کے
ناداں مطمئن ہے محبت کو ہار کے
کیا حوصلے ہیں اک دل ناکردہ کار کے
اشکوں نے میرا دامن امید بھر دیا
آنکھوں سے رولتا ہوں خزانے بہار کے
کتنی اداس، کتنی حزیں، کتنی مطمئن
تیور تو دیکھ چشم تغافل شعار کے
ویرانہ دے کہ جنت آغوش کی بہار
اے جبر دوست ہم ہیں ترے اختیار کے
اب ڈوبتے ستاروں کی جانب نہ دیکھئے
مارے ہوئے ہیں وہ بھی غم انتظار کے
کیوں یہ شکن جبین مشیت پہ آ گئی
گنوا رہا تھا میں تو ستم روزگار کے
کیوں فاتحین ماہ سے جھک کر ملیں نظر
بندے ہیں ہم تو بندۂ یزداں شکار کے

(افکار کراچی)

۵

ناہید صدیقی

ہستیوں کے دامن میں انقلاب پلتے ہیں
میکشوں کی لغزش سے میکدے سنبھلتے ہیں

یوں ہمارے ساتھ ایسے سست گام چلتے ہیں
جو سفر سے گھبرا کر راستے بدلتے ہیں

ظلمتیں اُجالوں پر فتح پا نہیں سکتیں
اک چراغ بجھتا ہے سو چراغ جلتے ہیں

دیکھیے کہاں پہنچیں یہ سفر کے دیوانے
آسماں کو تکتے ہیں اور زمیں پہ چلتے ہیں

کیا ہوا جو ساکن ہے آج سطح دریا کی
تہہ میں کتنے ہی طوفاں کروٹیں بدلتے ہیں

زندگی کو ڈھلنا ہے آج ان کے سانچوں میں
زندگی کی گرمی سے جن کے دل پگھلتے ہیں

ایک پل کے رُکنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

آشنا ہیں پروانے سوزِ غم کی ظلمت سے
شمع ہو تو جلتے ہیں اور نہ ہو تو جلتے ہیں

(عوامی دور دہلی)

ابنِ انشا

اے منہ موڑ کے جانے والی، جاتے میں مسکاتی جا
من نگری کی اجڑی گلیاں، سینے دھام بساتی جا

دیوانوں کا روپ نہ دھاریں، یا دھاریں، بتلاتی جا
ماریں یا ہمیں اینٹ نہ ماریں، لوگوں سے فرماتی جا

اور بہت سے رشتے تیرے، اور بہت سے تیرے نام
آج تو ایک ہمارے رشتے محبوبہ کہلاتی جا

پورے چاند کی رات وہ ساگر جس ساگر کا اور نہ چھور
یا ہم آج ڈبو دیں تجھ کو، یا تو ہمیں بچاتی جا

ہم لوگوں کی آنکھیں پلکیں — راہوں میں کچھ وا نہیں
شرماتی گھبراتی گوری، اتراتی اٹھلاتی جا

دل والوں کی دُور پہنچ ہے، ظاہر کی اوقات نہ دیکھ
ایک نظر بخشش میں دے کر لاکھ ثواب کماتی جا

اور تو فیض نہیں کچھ تجھ سے، اے بے حاصل اے بے مہر
انشا جی سے نظمیں غزلیں گیت کبت لکھواتی جا

(ادب لطیف لاہور)

اختر الایمان

پسِ دیوارِ چمن

نکہتِ گل نے سحر دم اسے بیدار کیا
دھیمے سے کہا، جا پسِ دیوارِ چمن
عشق پیچاں کی گھنی بیل کے پیچھے تنہا
چاہنے والا ترا دل میں لئے تیری لگن
منتظر کب سے ہے وہ چونک کے اٹھی جیسے
پہنچی آہستہ سے کوئی آہوئے وحشی چونکے
پھر چلی سوئے چمن زلفوں کو شانہ کرتی
اس تغافل سے کہ جیسے پئے گلگشت کوئی
یوں ہی جاتا ہو کوئی ملنے کا ارمان نہ ہو
اپنے سائے کے سوا اور سے پہچان نہ ہو

بہ رنگ بوئے گُل تر تھی کہیں بادِ نسیم
وہی وہ فرش پہ تھی، عرش پہ تھا ربِ کریم
لہلہاتا ہوا سبزہ تھا ندی، سبک خرام
چال ایسی کہ نہیں جس کا کہیں کوئی بھی نام
عنبر و مشک کا اِک قافلہ تھا زلف کا بار
یا کوئی ابرِ رواں دوشِ ہوا پر تھا سوار
پھول ٹوٹے ہمہ تن گوش تھے کچھ منہ سے کہے
خاک لپٹی چلی جاتی تھی قدم تھامے ہوئے
راہ میں کتنی جگہ شاخوں نے دامن پکڑا
بارہا شانے سے بے دھیانی میں آنچل ڈھلکا
شاخ سی لچکی، تخیل سے رُکی، اٹھلائی
ہر قدم پر نئے انداز سے ٹھوکر کھائی
میں وہاں گوش بر آواز جو بیٹھا تھا اٹھا
اور اسے لینے کو آغوش میں جیسے ہی بڑھا
پاؤں الجھا، گرا، یوں آنکھ کھلی پچھلے پہر
اور دیکھا کہ ابھی باقی ہے کچھ شب کا سفر
یونہی بیٹھا رہا، دیکھا کیا ہوتے تحلیل
پل کو گھڑیوں میں، دنوں سالوں میں لمحاتِ جمیل
زخم بنتے گئے ناسور بنے، اشک سب بہے
جیسے ہم گردشِ پرکار تھے، ویسے ہی رہے
تو جتنا ہمارا ہے آ گئے سحر نہ شام نہ نہی پہ لوحِ تدبیر پہ لکھا ہوا اک حرف نہیں

ادبِ لطیف
لاہور

حمایت علی شاعر

تین عورتیں

(جنہیں میں نے پنجاب، بنگال اور سندھ میں دیکھا)

(۱)

گیہوں جیسا رنگ سنہرا، گھنے گھنے گیسو
گال گلابی، ہونٹ عنابی، چال رم آہو
قامت جیسے ہری بھری سی کوئی لچکتی ڈال
پیراہن میں رچی بسی سی تن من کی خوشبو
چلے تو چاروں اور ہزاروں آئینے چمکیں
ٹھہرے تو اک خنک اجالا چھا جائے ہر سُو

راوی اور چناب میں ڈھل کر رنگ نکھرتا جائے

کھیتوں کھلیانوں کی گود میں روپ سنورتا جائے
دیکھو تو اک نار ہے لیکن سوچو تو جانو
وارث شاہ کی ہیر سناتا وقت گزرتا جائے

—— (۲) ——

سانجھ سمے سی سانوری رنگت بال گھٹا گھنگھور
نین دھلے آئینے جن سے جھانکے من کا چور
چال اترائی ہونٹ گلابی چھب نیاری ایسے دانت
بات کرے تو پھول کھلیں اور ہنسے تو جاگے بھور
ٹخنے ٹخنے پانی میں جیوں دھان جھکولے کھائے
دھرتی پر جب چلے تو لاگے ناچے کوئی مور

چھم چھم کرتی برکھا آئے انگ انگ لہرائے
پون بدن کو چھو کے پل پل دامنی بل بل جائے
جیسے نرمل کا کوئی نغمہ نین کا کوئی [illegible]
جیسے کسی ماجھی کا سپنا مورت میں ڈھل جائے

—— (۳) ——

چاندی ایسا رنگ روپہلا، کالے کالے بال
آب رواں کی طرح سبک اور نرم نشیلی چال

آنکھیں جیسے مدھ کے پیالے، کھلتی کلی سے ہونٹ
چہرے کے ہر خط سے نمایاں دل کے چھپے احوال
قامت جیسے سورٹھ راگ کی اک لچکیلی تان
پیشانی سے ٹپکے ابنِ قاسم کا جلال

مہراں کی موجوں میں پلے جیون سنگیت سنائے
طوفانوں کی زد میں رہ کر من کا دیپ جلائے
جیسے آدھی رات گئے کوئی اکتارا چھیڑے
جیسے شاہ لطیف کی کافی کوئی سناتا جائے

(افکار کراچی)

اختر انصاری

بنائے برباد

کاغذی ناؤ ترانے کی ضرورت کیا تھی؟
آگ میں پھول اگانے کی ضرورت کیا تھی؟
جس کے بننے ہی میں مضمر ہوں بگڑنے کے چلن
ایسی دُنیا کو بنانے کی ضرورت کیا تھی؟

سزا و جزا

نیک جو کام کئے اجر ملے گا اُن کا!
اور گناہوں کی سزا بھی ہے اس دلکو نہیں!
اُٹھ رہے ہیں جو ستم سوزِ جگر کے ہاتھوں!
حشر میں ان کی بھی کچھ داد ملے گی کہ نہیں

(عوامی دور دہلی)

راہی معصوم رضا

رُخصت اے وادیٔ گُل!

آج میں گزرے ہوئے چند مہینوں کی طرف
باندھ کر رختِ سفر دیکھ رہا ہوں کہ اگر
دورِ اس رزم گہِ عشق و رقابت سے کہیں
سامنا ہو تو یہ پہچان لیں شب ہو کہ سحر

ہائے کس کس کو نہ پوچھے گا یہ وحشت زدہ دِل
کہو اچھی تو ہے وہ ڈل میں نہاتی ہوئی شام
کیا سحر شوخ ہے اتنی ہی کہ جتنی شب تھی
کیا اسی طرح ہوا اب بھی ہے آوارہ خرام

رات تو اب بھی پہاڑوں سے اُترتی ہوگی
کیا جہلم اب بھی بچھاتا ہے وہی نور کے دام
آج کیا رنگ ہے یوسف کے خریداروں کا
کہو کیسی ہے زلیخائے شبِ ماہِ تمام
کیا اسی طرح بہک جاتے ہیں کم ظرف ابھی
کیا مئے اوجِ نظر اب بھی ہے رندوں پہ حرام

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
آج اس چادرہ گرپڑے کی قیمت کیا ہے
جب تھا میں تب تو خرد والوں کی سازش تھی قوی
اب جنوں والوں سے لوگوں کو شکایت کیا ہے
کیا ابھی ہوتی ہے رُسوا سرِ بازار وفا
وادیِ رنگ میں اب رنگِ سیاست کیا ہے

کتنے دیوانوں نے مل جل کے بنایا تھا جنہیں
سرِ راہ وہ مرے شیشے کے مکاں کیسے ہیں
پیار سے جن کے بھرا زخمِ غریب الوطنی
کچھ بتاؤ وہ مسیحا نفساں کیسے ہیں
آرزوؤں نے ہر اک گام پہ دیکھا جن کو
عشق کی راہ کے وہ سنگِ گراں کیسے ہیں

ہو کی رات میں امکانِ ملاقات کا نور
کہکشاں کیسی ہے تاروں کے جہاں کیسے ہیں
گلِ پژمردۂ صحرا لئے وفا کیسا ہے
اس گلی میں مرے پیروں کے نشاں کیسے ہیں

کچھ نہ کچھ بدلے تو ہونگے ہی وہ یارانِ قدیم
آ چلا ہوگا رقابت کا سلیقہ اُن کو
ایک حسرت تو نکل جائے بہت دو اِتنا
کبھی جی کھول کے ہنستے ہوئے دیکھا ان کو

ان سے کہہ دینا یہ پیغام دیا ہے مَیں نے
پھر رقابت ہی کریں، پہلے وفادار بنیں
بوئے پیراہنِ یوسف کی شکایت نہ کریں
آئیں بازار میں یوسف کے خریدار بنیں

(عوامی دَور دہلی)

علی جواد زیدی

ٹہوکے

یہ الم ناک، جنوں خیز، ستم گر راتیں
جانے کیا چپکے سے کہہ دیتی ہیں، سو جاتی ہیں
اور تنہائیوں کے بزم میں بجھتی شمعیں
بجھتے، بجھتے مری پلکوں کو بھگو جاتی ہیں
چند آہیں، مری حسرت کو ٹہوکے دے کر
غم امروز کے ویرانوں میں کھو جاتی ہیں
میں جو تصویریں بناتا ہوں تمناؤں کی
وہ بھی ہنستے ہوئے اغیار کی ہو جاتی ہیں
شہد بھی تلخ ہے اتنا، مری ہمدم! یہ کیوں؟
بات کیا ہے کہ تری جلوہ گہ ناز میں بھی
مری ہمدم! یہ مری تلخ نوائی نہ گئی
جگمگاتے ہوئے فانوس لٹاتے ہوئے نور
روشنی دل کے سیہ خانے میں آئی نہ گئی
اس شبستاں میں بھی خالی ہوئے ساغر لاکھوں
آگ جو دل میں لگی تھی وہ بجھائی نہ گئی
کھینچ لایا تھا مجھے جس کے لئے شوق یہاں
وہ مسرت ترے کاشانے میں پائی نہ گئی

پڑ گئی عشق کی آواز بھی مدھم، یہ کیوں؟

جس سے دھل جائے نہ تھکے پاؤں میں لپٹی ہوئی گرد
کیا ترے پاس وہ پایاب محبت بھی نہیں؟
صاف کر دے جو مری فکر کے چہرے سے غبار
کیا ترے بس میں وہ ہلکی سی مسرت بھی نہیں؟
جو مٹا دے مرے ماتھے سے شکن کے آثار
کیا مرے حصے میں وہ عکس لطافت بھی نہیں؟
کیا مرے دل میں نہیں عشرت امروز کا شوق
کیا مرے واسطے اک لمحۂ لذت بھی نہیں؟

حق تو سب کچھ تھا، مگر مجھ کو ملا کم، یہ کیوں؟

چند بہکے ہوئے سپنے تو سبھی کچھ لے جائیں
اور بس اتنا کہ خرابات نشیں ہیں ہم لوگ
جیسے دیکھے نہیں دنیا نے ابھرتے سینے
وہ سمجھتی ہے کہ کوتاہ جبیں ہیں ہم لوگ
ہم جو ابلیں تو یہ سب سیل میں بہہ جائے ابھی
وہ تو کہیے کہ تنگ ظرف نہیں ہیں ہم لوگ
اور ابلنا بھی پڑے گر تو کوئی بات نہیں
مفتیِ شرع تو کیا بانیِ دیں ہیں ہم لوگ

پھر نہ کہنا کہ تری بات ہے مبہم، یہ کیوں؟

(سب رس حیدرآباد)

خورشید احمد جامی

وفا نے جھوم کے جب تیرے گیت گائے ہیں
قدم افق پہ اندھیروں کے لڑکھڑائے ہیں

دیارِ ماہ وشاں سے خوشی کے دھوکے میں
ہزار بار نئے غم خرید لائے ہیں

ترے قریب پہنچ کر بھی کم نہیں ہوتے
غمِ حیات نے جو فاصلے بڑھائے ہیں

گلِ اجنبی سے تو انجان سی فضائے چمن
کچھ اس بہار کے انداز ہی پرائے ہیں

بہت طویل سہی راہِ جستجو۔ لیکن
بہت حسیں ترے گیسوؤں کے سائے ہیں

پڑا ہے عکس جو رخسارِ شعلۂ مے کا
تو آئینے تری یادوں کے جگمگائے ہیں

پیامِ یار۔ کہیں دشتِ شامِ ہجراں میں
جب آئے ہیں تو سحر در کنار آئے ہیں

مسافرانِ شبِ غم کی راہ میں جامی
خیال و فکر نے کتنے دیئے جلائے ہیں

(صبا حیدرآباد)

حفیظ ہوشیار پوری

تشنہ ساماں غرقِ حیرت مست دریا نوش بھی
ایک عالم میں ہیں اہلِ ہوش بھی بیہوش بھی

جلوۂ گل کی لپک ہے آشیاں تا آشیاں
اک بھبوکا بن گئی یہ آتشِ خاموش بھی

دوستو راہِ وفا کچھ اس قدر مشکل نہ تھی
دو قدم تو کاش تم چلتے مرے ہمدوش بھی

جلوہ فرمائی کا ہر انداز تھا محبوب تر
سامنے آتے رہے ہوتے رہے روپوش بھی

اہلِ غم غم کھاتے کھاتے پختۂ غم ہو گئے
اب تلافی کیا کرے گا بادۂ سرجوش بھی

زندگی میں آج بھی اُن کے سوا کیا کچھ نہیں
لذتِ کام و دہن بھی عیشِ چشم و گوش بھی

فرقِ حسن و عشق سمٹ کر ہی رہا آخر حفیظ!
اُن سے غافل ہو گئے ہم سے محبت کوش بھی

(سات رنگ کراچی)

عبدالحمید عدم

جو تیرے راز داں تھے بڑے معتبر ملے
کچھ نیم آشنا ملے، کچھ بے خبر ملے

ملتے ہیں یوں وہ صبح کے ہنگام جس طرح
بے ساختہ جزائے نمازِ سحر ملے

پاسِ تکلفات میں عمریں گزر گئیں
اِک دن تو بے دریغ نظر سے نظر ملے

مجھ کو جوابِ خط کی ضرورت نہیں مگر
صورت تو اُس کی دیکھ لوں گر نامہ بر ملے

کب تک یہ بار اٹھائے پھریں اپنے دوش پر
اب سر پٹک نہ دیں۔ جو کوئی سنگِ در ملے

سوچا تھا کوئی بات کریں گے نئی نئی
ہم کو مسیح و خضر بھی شوریدہ سر ملے

وہ رہزنِ حسیں نہ ملا اتفاق سے
ویسے تو راستے میں بڑے ہم سفر ملے

پھولوں کی طرح نرم سبو کی طرح حسیں
کیا حرج ہے جو زندگیٔ مختصر ملے

راہِ عدم طویل ہے نبضِ حیات سست
ساقی سفر دراز ہے زادِ سفر ملے

(نقوش لاہور)

جمیل الدین عالی

بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار ہے آجا
اور اب تو خاص وہی موسمِ بہار ہے آجا

کہاں یہ ہوش کہ اسلوبِ تازہ سے تجھے لکھوں
کہ روح تیرے لئے سخت بے قرار ہے آجا

وہ تیری یاد کہ اب تک سکونِ قلبِ تپاں تھی
تری قسم ہے کہ وہ اب بھی ناگوار ہے آجا

ہزار طرح کے افکار دل کو روند رہے ہیں
مقابلے میں ترے رنجِ روزگار ہے آجا

غزل کے شکوے غزل کے معاملات جدا ہیں!
مری ہی طرح سے تو بھی وفا شعار ہے آجا

گذر گئی ہیں بہت غم کی شورشیں بھی حدِ دل سے
مگر ابھی تو ترا سب پہ اختیار ہے آجا

بدل رہا ہے زمانہ مگر جہانِ تمنا
ترے لئے تو ابد تک بھی سازگار ہے آجا

(ماہِ نو کراچی)

سلام مچھلی شہری

○

قسم

—— زلف مہکی ہوئی، جگمگاتی جبیں
چہرہ دمکا ہوا، آنکھ ہے سُرمگیں
ہاتھ مہندی رچی، ہونٹ بھی احمریں
حُسن —— اور حُسن کی اس ادا کی قسم
آج آئے گی شاید قیامت کہیں

"بول" اک گیت ہے "سانس" اک ساز ہے
آج اک بانکپن، ایک انداز ہے
آج کچھ بات ہے، آج کچھ راز ہے
میرا دل کہہ رہا ہے، خُدا کی قسم
آج آئے گی شاید قیامت کہیں

آج ہر پھول جیسے "کرن پھول" ہے
آج سرکار کا ہر سخن پھول ہے
آرزو ایک خوشبو، بدن پھول ہے
ساتھ دیتی ہوئی اس فضا کی قسم
آج دم لے گی جلوؤں کی شدت کہیں

حسن خود بیں سہی، حسن تنہا نہیں
شمع جلتی بھی ہو، بن پتنگا نہیں
ان دنوں اہل دل کا بھروسہ نہیں
دیکھنا اس مچلتی حیا کی قسم
آ نہ جائے کسی کی طبیعت کہیں

آج جو بھی ادا ہے وہ منظوم ہے
پھر بھی یہ حسن باذوق معصوم ہے
آج کیسا زمانہ ہے معلوم ہے
وقت کی بہکی بہکی ہوا کی قسم
لٹ نہ جائے گل نو کی عظمت کہیں

(شمع دہلی)

سانولی سی ایک عورت

بھیج رہی ہے اب تک مجھ کو چاہت کے پیغام
سانولی سی اِک عورت، جس کا مردوں جیسا نام

وہ عورت جس کے ہونٹوں پہ ناچیں میرے گیت
جس کی بڑھتی شہرت کو میں سمجھوں اپنی جیت
سب دُنیا کو چھوڑ کے جس نے مجھے بنایا میت
سُنتا ہوں دن رات میں جس کی سانسوں کا سنگیت
چھائے میرے ذہن پہ اکثر بن کے الہام
سانولی سی اِک عورت، جس کا مردوں جیسا نام

ابھرے ابھرے ہونٹ ہیں اسکے کھلتے سرخ گلاب
اس کی رنگت مستقبل کا دھندلا دھندلا خواب
اس کے نغموں کی لے پر بہتا ہے مست چناب
اس کی چال چکوروں جیسی، اس کا بدن کمخواب
پیاس بھڑکتی ہے جب میری بن جاتی ہے جام
سانولی سی اک عورت، جس کا مردوں جیسا نام

میں جب اس کا ذکر کروں تو چونک پڑیں سب لوگ
کوئی نصیحت کرے مجھے اور کوئی منائے سوگ
دیکھا سنا ہے کب کوئی دو روحوں کا سنجوگ
اس بیچاری کو سب جانیں میری جان کا روگ
میری خاطر سہتی ہے سب دنیا کے دشنام
سانولی سی اک عورت، جس کا مردوں جیسا نام

میں کہتا ہوں ان لوگوں سے چھوڑو پچھلی بات
اپنے پیار سے میں نے اس کے بدل دیئے دن رات
دولت والے اسے خریدیں؟ کیا ان کی اوقات
برسے گی اب میرے ہی آنگن میں یہ برسات
میری ہی چاہت کا لے گی اپنے سر الزام
سانولی سی اک عورت، جس کا مردوں جیسا نام

چھوڑ کے عصمت کی منڈی اور جسموں کا بازار
پیش کرے اونچے محلوں میں وہ فن کے شہکار
مان لیا ہے سب نے اس کو اک سچی فنکار
زیب نہیں دیتا اب اس کو وہ گزرا بیوپار
اوروں کی مانند بھلا کب ہوتی ہے نیلام
سانولی سی اک عورت، جس کا مردوں جیسا نام

مان لیا کچھ اور بھی پہلے اس کے پیار کی ریت
ایک ہی سُر پہ کبھی نہ قائم تھا اس کا سنگیت
پھر بھی سب کو چھوڑ کے اس نے مجھے بنایا میت
جب تک وہ چاہے گی اندھے رہینگے میرے گیت
اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے وہ میرا انجام
سانولی سی اک عورت، جس کا مردوں جیسا نام

(شمع دہلی)

جگن ناتھ آزاد ایم اے

ایک مشکل

جو خط لکھوں تو کروں کس طرح خطاب تمہیں

سکونِ دل کہ نظر کا تمہیں قرار کہوں ۔ نشاطِ درد کہوں کیفِ انتظار کہوں
میں تم کو پھول کہوں پھول کا نکھار کہوں ۔ تمہیں بہار کہوں نغمۂ بہار کہوں
خبر نہیں کہ تمہیں محبوب یا حبیبہ کہوں ۔ کہ تم کو اپنی رگِ جاں سے بھی قریب کہوں
کہوں میں اپنے تخیل کی انتہا تم کو ۔ لکھوں خموشیٔ احساس کی نوا تم کو
شفق کا رنگ کہوں یا سحر کا نور کہوں ۔ کہ تم کو جلوۂ مہتاب کا ظہور کہوں
دیارِ دل کے لیے جنبشِ نسیمِ سحر ۔ کہوں میں کیفِ سحر تم کو یا شمیمِ سحر
تمہیں تلاطمِ نغمہ کہوں کہ ساز کہوں ۔ کہ رازِ اصل پسِ پردۂ مجاز کہوں
جہانِ کیف کہوں عالمِ سرور کہوں ۔ کہ اپنے ذوقِ نظر کا تمہیں غرور کہوں

شبابِ حسن کہ حسنِ شباب تم کو کہوں — کہ پچھلی رات کا اِک کیفِ خواب تم کو کہوں

غمِ نشاط کہوں یا کہوں سرورِ الم — تمہیں ہیں حاصلِ راحت کہوں کہ حاصلِ غم

کرم تمہیں وہ کہوں جس میں ہے امید کا خوں — جو ہے نشاط کا حاصل تمہیں ستم وہ کہوں

تمہیں شباب کا اندازِ والہانہ کہوں — غرورِ عشق کہوں نازِ عاشقانہ کہوں

نوائے ساز کہ میں تم کو نے نواز کہوں — تمہیں حقیقتِ عریاں کہوں کہ راز کہوں

سوالِ دیدہ و دل کا جواب تم کو کہوں — کہ اپنے شوق کی تعبیرِ خواب تم کو کہوں

تمہیں خیال کہ رعنائیِ خیال کہوں — کوئی مثال بھی دوں میں کہ بے مثال کہوں

کوئی بتائے کہوں تم کو نغمۂ منصور — کہ یا خطاب کروں تم کو کہہ کے شعلۂ طور

ہیں کیفِ دردِ محبت تمہیں کہوں نہ کہوں — میں اپنے دل کی امانت تمہیں کہوں نہ کہوں

تمہیں ہیں ایک مجسم ادا کہوں نہ کہوں — تمہیں ہیں پیکرِ شرم و حیا کہوں نہ کہوں

خطا معاف تمہیں شانِ بے نیاز کہوں — کہ دردِ عشق میں ڈوبی نگاہِ ناز کہوں

تمہیں ہیں حال کہوں ماورائے حال کہوں — تمہیں جمال کہ بے تابیٔ جمال کہوں

تمہیں ہیں جلوۂ رنگیں کہوں حجاب کہوں — خبر نہیں تمہیں پینا کہوں شراب کہوں

ہیں رازِ حسن کہوں تم کو حسنِ راز کہوں — کمالِ دردِ محبت کہ حدِ ناز کہوں

تمہیں ہیں نغمہ کہوں یا خموش سی فریاد — کہوں تمہیں ہیں دلِ شاد یا دلِ ناشاد

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہوں تو کیا تم کو — دوا کہوں کہ کہوں دردِ لا دوا تم کو

جو خط لکھوں تو کروں کس طرح خطاب تمہیں

(بیسویں صدی دہلی)

راجہ مہدی علی خاں

چراغ کہاں روشنی کہاں

ایکٹرلیس بننے سے پہلے

فلم میں کام کروں میں؟ مجھے مجبور نہ کر
سیم و زر کے لئے آنکھوں سے مجھے دور نہ کر

اُس چمن میں جو کلی بن کے مہک جاؤں گی
چلیں "الفنت کی ہوائیں" تو چٹک جاؤں گی
کبھی نظروں نے پلادی تو بہک جاؤں گی
میں تیرے پیار کی راہوں سے بھٹک جاؤں گی

سحر باتوں کا چلا کر، مجھے مسحور نہ کر
فلم میں کام کروں میں؟ مجھے مجبور نہ کر

جانِ جاں قتل نہ کر اپنے ہی ہاتوں سے مجھے
کیا کروں لگتا ہے ڈر عشق کی گھاتوں سے مجھے
نہ لبھا لے کوئی اُلفت بھری باتوں سے مجھے
نیند اسی غم میں نہ آئی کئی راتوں سے مجھے

پیار کا چاند ہوں ساجن مجھے بے نُور نہ کر
فلم میں کام کروں میں؟ مجھے مجبور نہ کر

وہ "کمانوں" کی کمیں گاہ، وہ "تیروں" کی زمیں
وہ تو ہے جرمِ محبت کے اسیروں کی زمیں
میں تو بستی ہوں وہ ہے عشق کے پیروں کی زمیں
مست البیلی اداؤں کا وہ دیس وہ ہیروں کی زمیں

اُن کی اک ہیر بنانا مجھے منظور نہ کر
فلم میں کام کروں میں؟ مجھے مجبور نہ کر

آرزو ہے کہ تری خوشیوں کا پیغام رہوں
منتظر میں تیری آمد کی سرِ شام رہوں
تیرے ہونٹوں کے قریں بن کے حسیں جام رہوں
میں تیرے پیار کی دُنیا ہی میں گمنام رہوں

اپنی گمنام کو ہر شہر میں مشہور نہ کر
فلم میں کام کروں میں؟ مجھے مجبور نہ کر

شمع ہوں دیکھ مجھے بھیج نہ پروانوں میں
حُسن کے نُور کو پہنچا نہ شبستانوں میں
اپنی لیلیٰ کو یوں ہی رہنے دے ویرانوں میں
تیری اپنی ہوں مجھے بھیج نہ بیگانوں میں
اجنبی خاک کو اس مانگ کا سیندور نہ کر
فلم میں کام کروں؟ مجھے مجبور نہ کر

بن کے بُت آ نہ سکوں گی کبھی بُت خانے سے
پھر نہ سمجھوں گی کبھی میں ترے سمجھانے سے
اور بھی اُلجھوں گی ساجن ترے سلجھانے سے
تیر واپس نہیں آتا کبھی پچھتانے سے
غیر کی باہوں میں جانا مرا منظور نہ کر
فلم میں کام کروں میں؟ مجھے مجبور نہ کر

ایکٹرس بننے کے بعد

اب بصد شرم و حیا چہرے سے اُٹھی وہ نقاب
لاکھ آنکھوں نے پڑھی اس رُخِ رنگین کی کتاب
ہر طرف آئی نظر بزمِ "قبول و ایجاب"
آئے طوفاں تو وہ بن گئی موجِ گرداب
مجھ سے شرماتی ہوئی مجھ سے ذرا دُور ہوئی
شوخیاں نظروں میں لانے پہ وہ مجبور ہوئی

پھر "چمن" میں وہ کلی بن کے مہکنے بھی لگی
چلیں الفت کی ہوائیں تو چٹکنے بھی لگی
جو نگاہوں نے پلا دی تو بہکنے بھی لگی
اور میرے پیار کی راہوں سے بھٹکنے بھی لگی

دم بدم عشق کی مے پی کے وہ مخمور ہوئی
زندگی اس کے لیے ساغر بلور ہوئی

جگمگانے لگی وہ شمع شبستانوں میں
ایک بجلی سی چمکنے لگی ایوانوں میں
دھوم سی مچ گئی اس شہر کے پروانوں میں
کیسی اپنی تھی بنی جا کے وہ بیگانوں میں

اپنی دل پھینک اداؤں سے وہ مشہور ہوئی
جس نے دل اس کو دیا اس کی وہ مشکور ہوئی

زلف کی قید سے ہنس کر مجھے آزاد کیا
مسکراتے ہوئے ہر غیر کا دل شاد کیا
خود تو شیریں نہ بنی اور مجھے فرہاد کیا
اس نے مجھ کو نہیں، میں نے اسے برباد کیا

میرے غم سن کے نہ اک لحظہ وہ رنجور ہوئی
سرمگیں آنکھ تھی اشکوں سے نہ بھرپور ہوئی

اب تو موٹر بھی ہے، کوٹھی بھی ہے اور نام بھی ہے
سیر جوہو کے کناروں کی سر شام بھی ہے

ساتھ اغیار کے ہونٹوں کے قریں جام بھی ہے
اور میرے ذکر پہ میرے لئے دُشنام بھی ہے

شمع محفل بنی، شعلہ بنی، مغرور ہوئی
کتنے غم دے کے مجھے ہائے وہ مسرور ہوئی

پھر کبھی لوٹ کے آئی نہ وہ بُت خانے سے
اس نے سمجھی نہ کوئی بات بھی سمجھانے سے
اور کبھی مجھ سے الجھتی گئی سلجھانے سے
تیرا بس نہیں آتا کبھی پچھتانے سے۔

ایک بجلی تھی، گھٹاؤں میں جو مستور ہوئی
میری جنت سے بہت دُور وہ میری حور ہوئی

(شمع دہلی)

اعجاز صدیقی

○

مل سکے گی اب بھی دادِ آبلہ پائی تو کیا!
فاصلے کم ہو گئے، منزل قریب آئی تو کیا!

ہے وہی جبرِ اسیری اور وہی غم کا قفس
دل پہ بن آئی تو کیا، یہ روح گھبرائی تو کیا!

اپنی بے تابیٔ دل کا خود تماشا بن گئے
آپ کی محفل سے بنتے ہم تماشائی تو کیا!

بات تو جب ہے کہ سارا گلستاں ہنسنے لگے
فصلِ گل میں چند پھولوں کو ہنسی آئی تو کیا!

لاؤ ان بے کیفیوں ہی سے نکالیں راہِ کیف
وقت اب لے گا کوئی پُر کیف انگڑائی تو کیا

کم نگاہی نے اسے کچھ اور گہرا کر دیا
وہ چھپاتے ہی رہیں رنگِ شناسائی تو کیا

پھر ذرا سی دیر میں چونکائے گا خوابِ سحر
آخرِ شب جاگنے کے بعد نیند آئی تو کیا

بیڑیاں وہمِ تعلق کی نئی پہنا گئے
دوست آ کر کاٹتے زنجیرِ تنہائی تو کیا

شورشِ افکار سے اعجازؔ وا ماندہ سہی
چھن سکے گی پھر بھی فکر و فن کی رعنائی تو کیا

(افکار کراچی)

شاعر لکھنوی

رفتارِ بہاراں سے خبردار بہت ہے
دیوانے کو زنجیر کی جھنکار بہت ہے

پردے میں ستم کے بھی ترا پیار بہت ہے
اس دھوپ میں یہ سایۂ دیوار بہت ہے

وہ زلف کبھی جب تو کھلے اور کچھ اسرار
سمجھے نہ تھے کہ ذکرِ رسن و دار بہت ہے

ہر موڑ پہ ملتے ہیں نئے زخمِ تمنا
آزادیٔ کوچہ و بازار بہت ہے

اب چشمِ پشیماں کی ضرورت نہیں کوئی
کیفیتِ رنگینیٔ رخسار بہت ہے

اڑ جائے دھواں بن کے نہ رنگِ شبِ ہجراں
اب تیز تری یاد کی رفتار بہت ہے

گھبرا کے وہ خود سامنے آ جائیں گے شاعر
اک کشمکشِ جرأتِ دیدار بہت ہے

(افکار کراچی)

...مار بارہ بنکوی

حسنِ پشیماں

...ب وہ پشیماں نظر آئے ہیں — موت کے ساماں نظر آئے ہیں

...ا نہ سکے زندگی بھر جو فریب — ایسے بھی ناداں نظر آئے ہیں

...شق میں کچھ ہم ہی پریشاں نہیں — وہ بھی پریشاں نظر آئے ہیں

...وش جب آیا ترے جانے کے بعد — گھر میں بیاباں نظر آئے ہیں

...ی ہے جو فکر اپنے گریباں کی — لاکھ گریباں نظر آئے ہیں

...شق ہے فرسودہ حکایت مگر — نت نئے عنواں نظر آئے ہیں

...ونہ ہو اب آگئی منزل قریب — راستے سنسان نظر آئے ہیں

...ٹھے ہیں ساحل سے جو بے اختیار — ایسے بھی طوفاں نظر آئے ہیں

ہائے لیے وہ مے بھری آنکھیں خمار
میکدے ویراں نظر آئے ہیں

(صبحِ اُمید کلبھٹی)

مولانا انور صابری

ملے تو کیسے ملے حسنِ زندگی کا سراغ
ہلاکِ گردشِ ایام ہیں ضمیر و دماغ

جلی ہوئی ہیں بظاہر ہزار ہا شمعیں
بجھے بجھے نظر آتے ہیں انجمن کے چراغ

خرد نے لاکھ لگایا ہے زورِ چارہ گری
نصیب ہو نہ سکا دردِ آرزو سے فراغ

کلی کلی ہے تبسم کی موج سے محروم
بہار میں بھی خزاں خوردہ ہے حیات کا باغ

محیطِ دیدۂ پُر شوق ہے غمِ ہستی
مے نشاط سے خالی ہیں اہلِ دل کے ایاغ

نشیمنوں میں عنادل کے دیکھتا ہوں میں
جگر خراش ہجومِ نوائے شپر و زاغ

خدا کا شکر ہے کہ اس دورِ پُر کثافت میں
قبائے شعر و ادب ہے مرے لئے بے داغ

(سبے داغ

میرے زیرِ نگیں

رہِ حیات کی سختی نہ جھیل سکتا میں
جو تیرے ہاتھ کی نرمی نہ مل گئی ہوتی
نہ جانے کب یہ دل نہ اسرد پڑ جاتا
جو تیرے قرب کی گرمی نہ مل گئی ہوتی

جو تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہے یونہی
تو میرے ساتھ زمانہ ہے کامرانی ہے
جو تیرا قرب مرے ہاتھ میں قلم دیدے
تو میرے زیرِ نگیں شعرِ جاودانی ہے

(عوامی دور دہلی)

باقر مہدی

جاتے جاتے

آخری رات غزل کوئی سناتے جاؤ
شمع اک اور اُمیدوں کی جلاتے جاؤ!

کتنے الفاظ تڑپتے ہیں نئے معنی کو
مسکرا کر انہیں اشعار بناتے جاؤ!

جانے کس طرح کی اُمید لگا رکھی تھی
نامرادی کا چلن دِل کو سکھاتے جاؤ!

ہم نے تم سے تو کبھی کوئی شکایت بھی نہ کی
اب جو جاتے ہو تو "بیگانہ" بناتے جاؤ!

ایک نازک سا جو دھاگا تھا نئی باتوں کا
اپنی آواز سے پھر اس کو بلاتے جاؤ!

ہم کبھی پھر نہ ملیں گے مگر اتنا تو کرو
جاتے جاتے ہمیں زہر اب پلاتے جاؤ!

یہ بھی ممکن نہ اگر ہو تو ٹھہر کر پل بھر
شمع آنچل سے امیدوں کی بجھاتے جاؤ!

بے وفائی کی قسم رازِ محبت کیا ہے؟
ایک یہ بات ذرا ہم کو بتاتے جاؤ!

تاکہ ہم بھیج سکیں اپنی تباہی کی خبر
گر پتہ ہو کوئی اپنا تو بتاتے جاؤ!

(خیال کاسمیؒ)

حسرت جے پوری

پہلی نظر

ہائے وہ پہلی نظر وہ اس کی آنکھوں کا پیام
وہ لجا کر مسکرا کر ——— دستِ نازک سے سلام

ہر نظر میں میکدے غلطاں، وہ چنچل بانکپن
رنگِ گلشن بھی تصدق، یوں سراپا گل بدن

سر پہ جھومر پاؤں میں پازیب اک زہرہ خصال
اور مجسم کہکشاں اس کے دوپٹے کا جمال

برق کی تصویر کل شانوں پہ لرزاں چوٹیاں
مرمریں ہاتھوں میں اپنی دھن میں گاتی چوڑیاں

کان میں بندے سراپا آفتاب و ماہتاب
پردہ داری کیا کہوں رخ پہ تجلی کی نقاب

چال میں آہو کی شوخی، چال میں بدمستیاں
ہر قدم پہ انقلابِ دہر کی رنگینیاں

تکلم اک قیامت، ہر تبسم برق ریز
اور جس کی سادگی بھی اِک فسانہ حشر خیز

با تکلف با ادب، صد ناز وہ جنت بدوش
ایک دن آئی مری پرسش کو وہ نکہت فروش

آنکھوں آنکھوں میں دیا پیغامِ عشق و بیخودی
زندگانی اِک شرابِ تند بن کر رہ گئی

تھی وہ دزدیدہ نگاہ دبستاں میرے لئے
آ گیا تھا میرے گھر ہی گلستاں میرے لئے

جیسے مل جائے خدائی اس طرح مسرور تھا
گھر کی رونق کیا کہوں سینے کا اک طور تھا

وہ تحیر خیز وہ کافر نظارے سے الاماں
وہ مجسم الاماں ابہام اشارے سے الاماں

یوں مجھے گھیرے ہوئے تھا اپنا سوزِ نو کا جال
پتیوں کی قبا میں جیسے کسی بھنورے کا حال

میری جانب دیکھ کر ہنس ہنس کے شرماتی رہی
نکہتِ گیسو سے اِک اِک سانس مہکاتی رہی

نیچی نظروں سے وہ کچھ کہتا بعنوانِ حیا
آپ کب تشریف لائیں گے، یہ اس کی التجا

کیا کہوں کیسے کہوں رہ رہ کے یہ سوچا کیا!
جب نہ کچھ بھی بن پڑا، تو درد میں ڈوبا کیا

یاس سے اٹھی نظر، آنسو بہا کر رہ گئی
اور زبانِ حال آخر، لڑکھڑا کر رہ گئی

الغرض ہونے لگی رخصت وہ جانِ آرزو!
اشک برسانے لگا، آخر جہانِ آرزو

کچھ بچشمِ نم اٹھا میں رخصتی تعظیم کو
مسکرا کر ہاتھ اٹھایا اس نے پھر تسلیم کو

اس کا جانا تھا کہ ویراں ہو گئی میری نظر
لے گئی ہمراہ اپنے رونقِ دیوار و در

کس قدر رنگین تھی فطرت کی لطافت نہ پوچھ
شوخیاں کرتی ہوئی تاروں کی شہزادی نہ پوچھ

(شیخ امید مجیبی)

خلیل الرحمن اعظمی

رفتگاں

دروازے اُداس اور گم سم
دہلیز کو چپ سی لگ گئی ہے
اب دُور سے اُن کے قہقہوں کی
آتی نہیں آج کوئی آواز
اب کوئی نہ انگلیوں کی جھنکار
نے قدموں کی کوئی رہ گئی ہے

کس حال میں ہیں یہ کون جانے
سب اپنے وہ ہم سبق وہ ساتھی
کہہ کر تو گئے تھے پھر ملیں گے
کیا جانے کہ اُن پہ کیسی بیتی
آوارہ ہے کون اب بھی پھرتا!
راس آگئی کس کو گھر گرہستی!

آتے ہیں بہت سے آنے والے
کچھ اجنبی، کچھ رفیق و ہمدم
لیکن کئی سال مجھ پہ گزرے
سننے کے لئے ترس گیا ہوں
دستک، کہ جواب بھی جانتی ہو
وہ نام جو میرا پیار کا ہے

(شاعر لکھنویؒ)
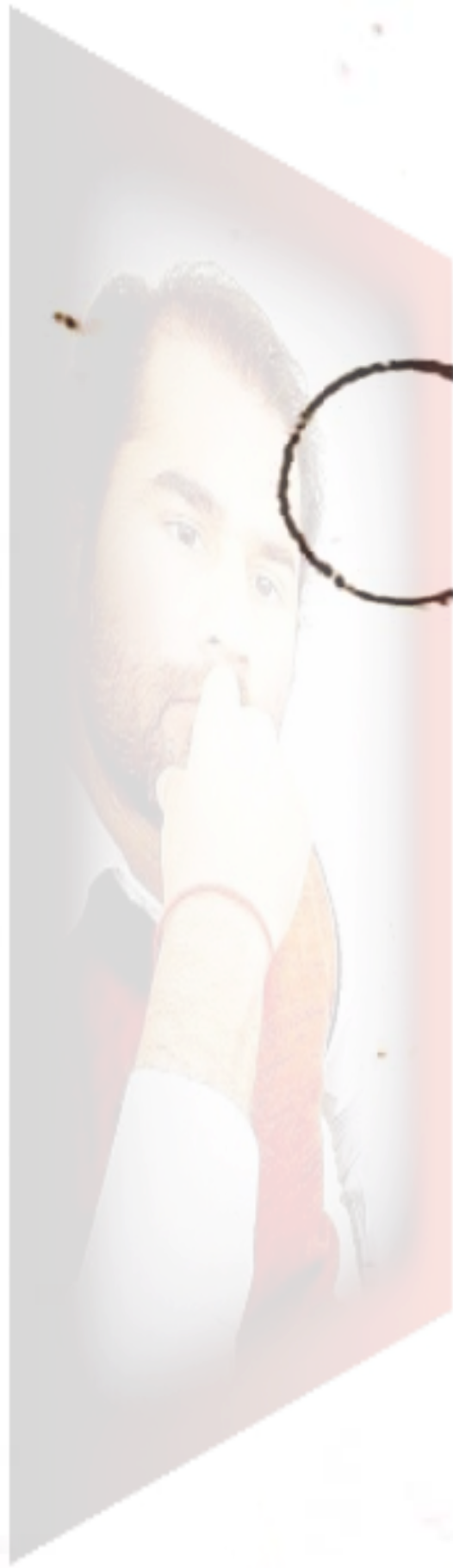
گوپال متل

جو شعاعِ لب ہے موجِ نو بہارِ نغمہ ہے
خامشی بھی آپ کی آئینہ دارِ نغمہ ہے

گوش اک مدت سے محرومِ سماعت ہے مگر
دل عجب نادان ہے اب تک اعتبارِ نغمہ ہے

فرق یہ ہے نطق کے سانچے میں ڈھل سکتا نہیں
ورنہ جو آنسو ہے دُرِ تابدارِ نغمہ ہے

منکرِ سازِ مسرت ہوں تو کافر ہوں مگر
ہم نشیں! مضرابِ غم پر انحصارِ نغمہ ہے

اے کہ شکوہ تھا تجھے سنگیں مزاجی کا مری
دیکھ! اس پتھر میں بھی موجِ شرارِ نغمہ ہے

(سوغات بنگلور)

مخمور سعیدی

رازداں
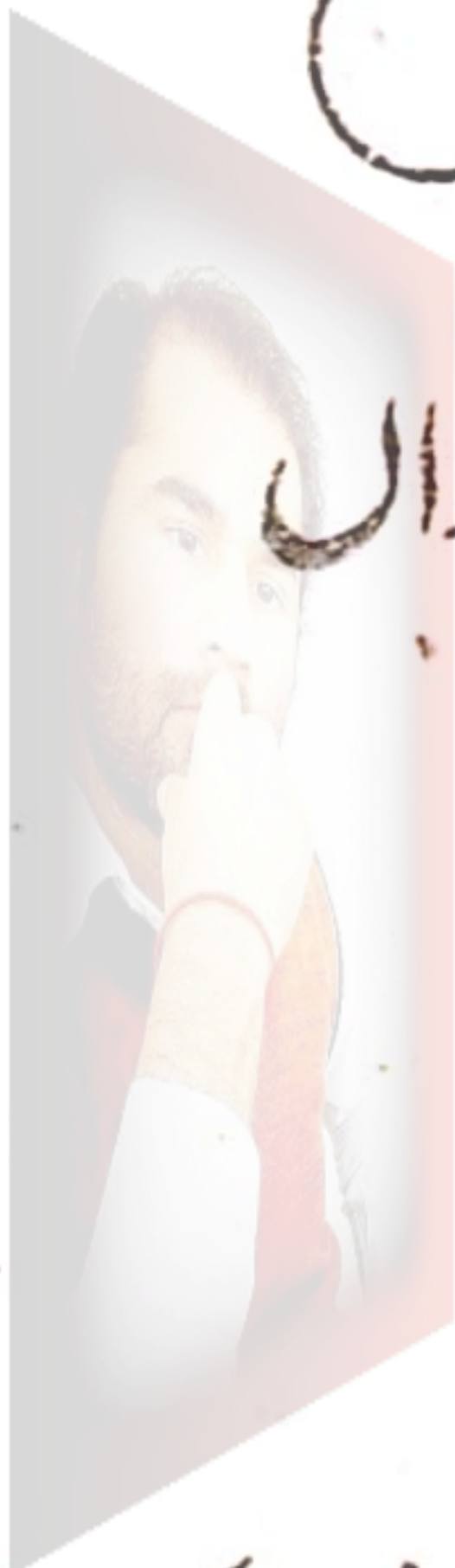
چنار کا یہ سلگتا ہوا اُداس درخت
اسی درخت کے سائے میں تو نے، ہم نے
خود اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی
ہم اتنے پاس ہیں کیوں، جاننے کی کوشش کی

اسی درخت کے سائے میں ایک دن تم نے
جھٹک دیا تھا مرا ہاتھ، کیوں خدا جانے
میں سوچتا ہوں وہ کتنا عجیب لمحہ تھا
جو بدگماں مری جانب سے کر گیا تم کو

چنار کا یہ سلگتا ہوا اداس درخت !
اب اس درخت کی شاخوں میں اس کے پتوں میں
تمہاری زُلف کی خوشبو نہ سرسرائے گی
اب اس درخت کے نیچے میں تن بہ تنہا ہوں

اب مَیں چاہتا ہوں مری زندگی کے صحرا سے
اب اس درخت کا سایہ کبھی نہ رخصت ہو
کہ اس درخت کے سائے میں بیٹھ کر مجھ کو
تمہاری فطرتِ معصوم یاد آتی ہے

(شمع شہ بلی)

پریم واربرٹنی

میک اَپ ...... (ایک فلم ایکٹرس سے)

لڑکپن اُڑ گیا عمرِ رواں کی تیز آندھی میں
جوانی جھرّیوں کے جال میں پھر پھڑاتی ہے
کوئی طوفان جب اٹھتا ہے سینوں کے سمندر میں
تو رہ رہ کر سنہرے حادثوں کی یاد آتی ہے

جو آنکھیں آبگینوں سے زیادہ خوبصورت تھیں
وہ آنکھیں اب شرابِ شعر کی مستی سے خالی ہیں
سنہرے چاند نے جن سے ضیا کی بھیک مانگی تھی
وہ جلوے چند چمکیلے ستاروں کے سوالی ہیں

گھنیرے گیسوؤں میں اب کوئی بدلی نہ جھومے گی
نگاہوں سے نشاط و نور کے شعلے نہ لپکیں گے
وہ آنکھیں جن میں خوابوں کے جزیرے جگمگاتے تھے
انہیں بھی دیکھ کے اہلِ نظر پلکیں نہ جھپکیں گے

لب و رخسار و چشم و زلف کے انداز کیا کہیے
کہیں سرخی کہیں غازہ کہیں کاجل کے ڈورے ہیں
ہوس کی آگ سے بھڑکا ہوا ہے جسم کا شعلہ
بڑھاپے کے تلاطم میں لڑکپن کے ہلورے ہیں

یلے ابروں کی نرم لچکیلی کمانوں پر
ڑھائے جا رہے ہیں تیر شرمیلی نگاہوں کے
ٹھائی جا رہی ہیں مرمریں سینوں کی محرابیں
یامت ڈھا رہے ہیں زاویے بے باک باہوں کے

کبھی صورت اس آئینے کی حیرانی نہیں جاتی
سنورتے جس نے دیکھا ہر گھڑی ڈھلتی جوانی کو
ابھی اس حسنِ آوارہ کو پوجیں گی کئی نظریں
ابھی تو ان گنت عنواں ملیں گے اس کہانی کو

یہ رنگ و بو کی رعنائی یہ غازے کی دل آرائی
اسی نے حسن کی بوڑھی بہاروں کو نوازا ہے
یہ غازہ ذوقِ زیبائش کا ساماں ہی سہی لیکن
یہ غازہ حسن کے بے جان جلووں کا جنازہ ہے

(شمع دہلی)

نریش کمار شاد

دو آوازیں

پہلی آواز

مانتا ہوں دل نشیں اشعار کہہ سکتا ہے تو
تیری فکرِ عنبریں سے ہے اِک جہانِ رنگ و بُو
تیرے کیف انگیز نغموں سے فضا مسحور ہے
اور دُنیائے ادب میں تو بہت مشہور ہے
دلنشیں اشعار لیکن پیٹ بھر سکتے نہیں
بے نیازِ تلخیٔ حالات کر سکتے نہیں
زندہ رہنے کے لئے نان و نمک درکار ہے
زندگی نغمہ نہیں تانبے کی ایک جھنکار ہے
اِس لئے اس شاعرانہ بانکپن کو چھوڑ دے
زندگی میں مصلحت سے کام لینا سیکھ لے

افسروں کی چاپلوسی کو بنا اپنا شعور
چاپلوسی پر ہے دُنیاوی ترقی کا مدار
دفن کر دے فائلوں میں نازک احساسات کو
اور پلّے باندھ لے اسے بے خبر اس بات کو
شاعری ہے ایک ایسی تند خو سی نازنیں
جو رقیب اپنا کبھی برداشت کر سکتی نہیں
شعر کہنے کے مرض میں ہو گیا جو مُبتلا
شعر کہنے کے سوا ہر کام سے جاتا رہا
شاعری دیوانگی ہے چھوڑ یہ دیوانہ پن
تجھ کو رہنا ہے اگر دُنیا میں دُنیادار بن
شاعری تیرے وطن میں مستقل آزار ہے
نوکری کی فکر کر فکرِ سخن بے کار ہے
بھُول جا اے شاد اپنی شاعری کو بھُول جا
کر کلرکی کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھُول جا

دُوسری آواز

مانتا ہوں ظلمتِ ماحول میں ہے تو اسیر
تیرگی میں بھی تیری فکر و نظر دیتی ہے نور
جبرِ ہستی کر نہیں سکتا تری ہمت کو پست
تیری فطرت میں ہے شامل رنج و غم سے کھیلنا

کم نظر ہیں پھر بھی جو تجھ کو سمجھتے ہیں حقیر
تیرے احساسات میں ہے لو بنو صبحوں کی ضو
تیری خودداری کو دُنیا سے نہیں سکتی شکست
مسکرا کر زندگی کی سختیوں کو جھیلنا

تپ کے آفاتِ جہاں کی دھوپ میں آئے جانِ من
اور بھی نکھرے گا تیری شاعری کا بانکپن !

مصلحت کے در پہ جھک سکتی نہیں تیری جبیں
تو زمانہ ساز بن جائے یہ ممکن ہی نہیں

تیرا احساسِ تپاں بے سوز ہو سکتا نہیں
جاگ کر تیرا شعورِ شعر سو سکتا نہیں

تیری شریانوں میں ہے ہر ابنِ آدم کا لہو
جب کوئی بھی زخم کھائیگا تڑپ اُٹھیگا تو

ٹھیک ہے یہ دورِ سیم و زر کا اک بازار ہے
اور اس بازار میں جنسِ سخن بیکار ہے

زندگی اس دور کی لیکن ہے بالکل مختصر
چند دن تک اور ہے ناقدریٔ اہلِ ہنر

یہ معاشی الجھنیں دو چار دن کی بات ہیں
کل تو ہو سکتے نہیں ہیں آج جو حالات ہیں

فکر کیا اس دور کے جاں کاہ ظلم و جور کی
شاد تو ہے امانت اس آنے والے دور کی

(آج کا ادب دہلی)

اجمل اجملی
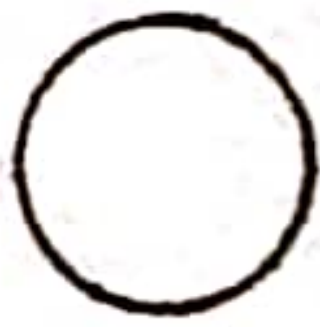
ایک شام

آج کی شام قیامت بہ کنار آئی ہے

جانے کیوں ڈوبتے سورج کی شعاعوں کی طرح
آس کی آنچ بھی معدوم ہوئی جاتی ہے
جانے کیا ہے کہ سرِ شام ہی یہ دل کا دیا
میرؔ کے شعر کی تفسیر بنا جاتا ہے
عالمِ یاس میں ڈوبا ہوا اک ایک شجر
اپنے ہی سائے کی تصویر بنا جاتا ہے
ذہن آوارہ خیالات کے ہنگاموں میں
کسی دیوانے کی تقریر بنا جاتا ہے

بزمِ احباب بھی ہے بادہ بھی ہے جام بھی ہے
بعض ہونٹوں پہ بصد ناز مرا نام بھی ہے

بعض آنکھوں میں مرے واسطے پیغام بھی ہے

دل بلانوش بھی ہے مے کا پرستار بھی ہے
بعض ہونٹوں سے لبے واقعی کچھ پیار بھی ہے
بعض آنکھوں سے توجہ کا طلب گار بھی ہے
بعض زلفوں کے شکنجے میں گرفتار بھی ہے

وہ اٹھی ایک نظر، جانِ غزل، روحِ سخن
وہ لبے ہونٹ کسی نے وہ پکارا مجھ کو
وہ مرے واسطے ڈھلکا کوئی دلکش آنچل
شوخ تھی یہ وہ اک لب نے ابھارا مجھ کو
بادۂ ناب کی اس سرخ قبا دلہن نے
وہ کیا اوٹ سے ساغر کی اشارہ مجھ کو

میں مگر ہوں کہ مجھے کوئی بھی احساس نہیں
کل یہی بزم کی رنگیں فضا راس نہیں

اُف یہ الجھن ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
آ مرے دل، کہ سکوں کا کوئی گوشہ ڈھونڈیں
بزم بے کیف ہے، آ چل سوئے ویرانہ چلیں

بادۂ بے رنگ ہے زہرِ غمِ جاناں نہ پئیں
آ، کسی کنج کے آغوشِ تہی میں بیٹھیں
اور اسی شاہدِ رعنا کا تصوّر کر لیں
جس نے خود پیار کا وہ تاج محل توڑ دیا
جس کی تعمیر میں اس کا بھی لہو شامل تھا

ایک رات

آج کی رات قیامت بہ کنار آئی ہے

چاند طوفان میں الجھی ہوئی کشتی کی طرح
دور آفاق کی پہنائی میں لرزیدہ ہے
چاندنی روتی ہے ویران منڈیروں کے قریب
ذرہ ذرہ مرے ماحول کا نم دیدہ ہے

شام ہی سے دلِ وارفتہ ہے بیتاب بہت
بے پئے محفلِ رنداں سے چلا آیا ہوں
نظریں اٹھتی ہی رہیں ہونٹ بلاتے ہی رہے
میں مگر بزمِ غزالاں سے چلا آیا ہوں
حسن والوں کی عنایاتِ نظر ٹھکرا کر
مجمعِ لالہ عذاراں سے چلا آیا ہوں

بزمِ بے کیف تھی، میں جانبِ ویرانہ گیا
دل کے تھم جانے کی موہوم تمنائیں لئے
زخم سِل جانے کی معصوم تمنائیں لئے

کل جسے دل سے بھلانے کی جسارت کی تھی
آج اسی شوخ تصور کو پکارا میں نے
گو کئی زخم ابھر آئے مگر دل کے لئے
یاد کی بزم کو پھر سے حال سنوارا میں نے
اے مرے زخم بھرے دل تری تسکیں کے لئے
کتنے ارمانوں کا ڈھونڈا ہے سہارا میں نے
پھر بھی الجھن میں تری کوئی کمی ہو نہ سکی
ختم افسردگی و تشنہ لبی ہو نہ سکی

بزم بے کیف تھی ویرانہ بھی راس آ نہ سکا
دل کی الجھن ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
آج کی رات بھی آنکھوں ہی میں کٹ جائے گی
آج ساحل سے بڑی گرم ہوا آتی ہے

ایک صبح

آج کی رات قیامت بہ کنار آئی تھی!
رات بھر جلتے رہے پلکوں پہ آنسو کے چراغ

موم کی طرح پگھلتا رہا، پتھر سا بدن
دل کے دروازے پہ تھپکتی رہی اک شوخ کی یاد
کتنی مرحوم امیدوں کے بھیانک سائے
ذہن کے بند دریچوں پہ صدا دیتے رہے
نرم بستر پہ ہر اک زہر سے بھرپور شکن
رات بھر ڈستی رہی یاد کی ناگن کی طرح
چاندنی میری امنگوں کو کفن پہنانے
کبھی روزن سے اتر آتی، کبھی دستک آتی
کبھی بستر پہ مچلتی کسی الہڑ کی طرح
کبھی پیروں سے لپٹتی، کبھی سرہانے آتی
نیند اک وعدہ شکن شوخ کے وعدوں کی طرح
کبھی اڑتی، کبھی پلکوں کے نگر تک آتی
کبھی خوشبوئے بدن وصل کا مژدہ دیتی
کبھی پیشانی پہ آگین لمس کی آہٹ بنتی
کبھی ہونٹوں پہ مہکتی کسی بوسے کی گلاب
کبھی کھلتا مرے پہلو میں تنفس کا گلاب
کبھی جلتے ہوئے دیپک پہ نگاہیں پڑتیں
کبھی ڈھلتی ہوئی ہستی کا تصور آتا
ہاں کبھی سرحد ادراک پہ دستک دیتی
کبھی ماحول کے تاریک نہاں خانوں میں

باپ کی بوڑھی تمنّاؤں کے جگنو اُڑتے
کبھی بہنوں کی محبّت سے چراغاں ہوتا
کبھی احباب سے دوری کے کچوکے لگتے
کچھ بزرگوں کی عنایت کبھی سایہ کرتی
کچھ رفیقوں کے گرم صورت نشتر چبھتے
کبھی تحریک کی عظمت کا سہارا ملتا
کبھی مقصد کی صداقت کا سہارا ملتا

ہاں مگر ان گنت افراد کی اس دنیا میں
کس کو اک فرد کی حالت کا خیال آتا ہے
میری اُلجھن مری بے چینی کے احساس سے دور
وقت مانوس گذرگاہ سے گذرا ہی کیا
ڈھل گئی رات مرے خواب بھی دم توڑ چکے
صبح آئی ہے پہ اس درجہ تھکن ہے کہ نہ پوچھ

ہر گھڑی جیسے قیامت کی گھڑی گذری ہے
رات گذری ہے کہ اک پوری صدی گذری ہے

(بے داغ دہلی)

سرودش

زندگی کے شبستان میں
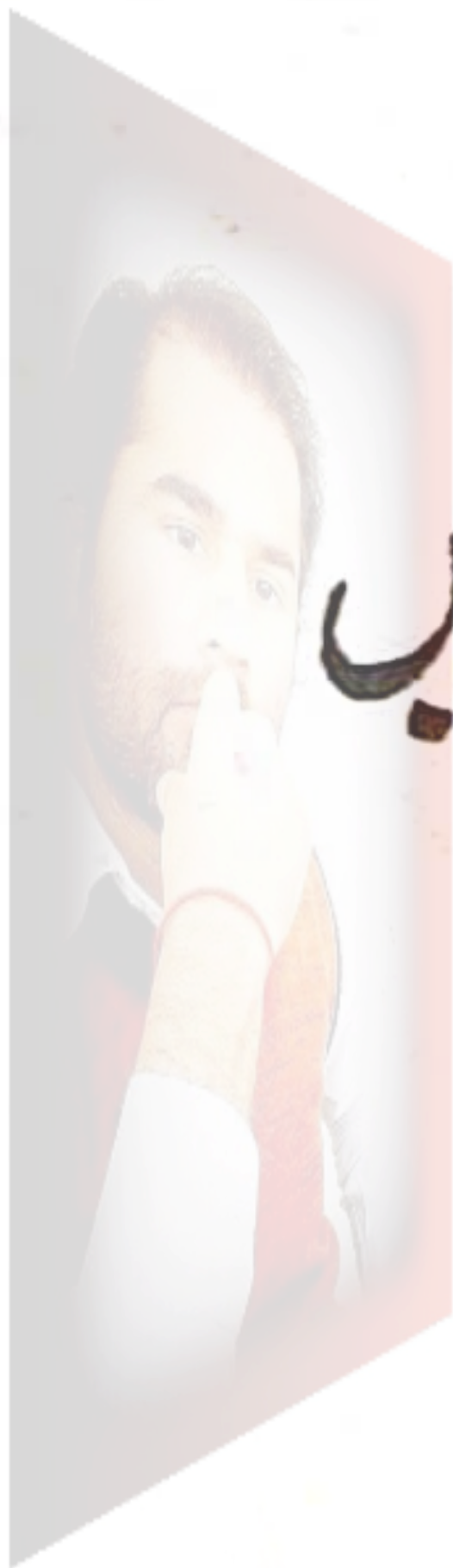
سال، سرشار، چنچل حسینہ
زندگی! میری جان تمنا
فرحت اثر غیر فانی
جاں فزا جاودانی
کا مسکن ہے تیرا گلستاں
یہاں اور پریشاں و حیراں

مجھے بخش دے اپنی کافر جوانی
چھلکتا ہوا ساغرِ شادمانی
مرے دل کی بیتابیوں کو عطا کر
مچلتا ہوا کامرانی کا پیکر

کہ جی بھر کے غم کا تمسخر اڑا لوں
شکستِ غمِ عشق پر مسکرا لوں

ترا حسنِ فرحت اثر غیر فانی!
ترا نغمۂ جاں فزا جاودانی!
یہ شب رنگ زلفیں مہکتی رہیں گی!
یہ رنگیں بہاریں لہکتی رہیں گی!
یہ خوش رنگ عارض دمکتے رہیں گے
یہ گل رنگ ساغر چھلکتے رہیں گے

مگر میں چلا جاؤں گا پھر یہاں سے
مجھے بخش دے اپنی کافر جوانی

(بے داغ دہلی)

...ن موہن ایم اے

انجام

چیلیں، کوّے، گِدھ آ بیٹھیں گے
نوچیں گے، کھائیں گے، اُڑ جائیں گے

— — — — — — — — —

شوخ، دہکتے رخسارے بھی
رخساروں کے دہکتے شعلے
پیشانی کے چمکتے شعلے
اور آنکھوں کے لپکتے شعلے
یہ سب شعلے اپنا اپنا زور دکھا کر
آخر اک دن، سیلِ فنا کی زد میں آ کر رہ جائیں گے
بجھ جائیں گے ۔ یہ سب جلوے سیلِ فنا میں بہہ جائیں گے
اور فلک پر کاہکشاں بھی دیکھ رہی ہو گی یہ منظر
جیسے اب دیکھا کرتی ہے — — —

دُور بہاراں ——— دورِ خزاں بھی

اور تمہاری مانگ کے تارے ——— شوخ ستارے

کاہکشاں میں ڈھل جائیں گے ——— چمکا کریں گے

اور چمک کر آخر اک دن بجھ جائیں گے — — —

وہ دیکھو پہنائے فلک میں

اک ننھا سا تارا ٹوٹا — — —

پھول سا نازک جسم تمہارا

کیف و رنگ و نور سراپا — — —

رُوح ہماری زندہ رہے گی ——— کب تک؟ ——— یہ معلوم نہیں

لیکن ڈھانچہ

ڈھانچہ ——— پنجر ——— جسم کا پنجرا

نیلی نیلی اس پنجرے کی —

چیلیں، کوے، گدھ آئیں گے

نوچیں گے، کھائیں گے، اڑ جائیں گے

(بیسویں صدی)

گلنار زنتشی دہلوی

گردشِ ایام

چمن میں جب فلک سے گردشِ ایام آتی ہے
جھجک کر صبح آتی ہے ٹھٹھک کر شام آتی ہے

نہیں جب میکدے میں اب ندِ عالی ظرف ہی باقی
زباں پر کس لئے ساقی حدیثِ جام آتی ہے

مرے رنگین اشکوں نے گلوں کی آبرو رکھ لی
وگرنہ نوکِ خارِ سبزہ خوں آشام آتی ہے

یہ کل کی بات ہے ظلمت کدے میں ہم ترے جب تھے
مگر یہ بات بھی ہم پر پئے الزام آتی ہے

تیمم خاکِ میخانہ سے کرتے ہیں وضو جن سے
سواری جن کی باندھے جامۂ احرام آتی ہے

پئے گلگشت وہ گل پوش جب آتا ہے گلشن میں
خس و خاشاک سے بوئے گلفام آتی ہے

وہ جس پر میری آوازِ شکستِ دل کا دھوکہ ہو
یہ کیسی مجھ کو آوازِ شکستِ جام آتی ہے

خزاں کا وار یکساں ہے گل و خارِ گلستاں پر
جب آتی ہے تو گلشن میں تباہی عام آتی ہے

انہیں کد ہے کہ پھر گلزار میں فصلِ خزاں آئے
مجھے ضد ہے وہ کیسے در پئے آلام آتی ہے

(جمالستان دہلی)

محسن زیدی ایم اے

ہم نے تیرا غم اپنایا اور اتنے رنجور ہوئے
دل پہ جتنے زخم لگے تھے آخر سب ناسور ہوئے

رات کو میخانے کی زینت رونق ماہ و انجم تھی
صبح سے پہلے ٹوٹ گئے شیشہ و ساغر چور ہوئے

دل والوں نے سوچ لیا تھا تیرے در پہ نہ جائیں گے
لیکن اک ٹھوکر وہ آنے ہی پہ مجبور ہوئے

ہاتھ میں جب تک جام نہیں تھا شام و سحر بے نور تھے
ہاتھ میں جب جام آتے ہی شام و سحر پرنور ہوئے

کل تک رسم و راہ تھی ہم سے آج بنے ہیں بیگانہ
روپ نگر کے بسنے والے کیوں اتنے مغرور ہوئے

ہم نے یوں تو کتنے ہی نغمے لکھے عشق کے عنواں پر
جو تم سے منسوب ہوئے وہ نغمے ہی مشہور ہوئے

اپنے لئے محسن دنیا کے رنگ و بو میں کچھ بھی نہ تھا
ہم تو کسی کے پیار کی خاطر جینے پر مجبور ہوئے

(بیسویں صدی دہلی)

افضل پشاوری

ایک سوال

ہر گوشۂ دل کو جو ضیا بار کیا تھا!
دامن کو حسیں جلووں سے گلزار کیا تھا
جی بھر کے بھی لطف سے سرشار کیا تھا
کیا آپ نے دو دن کے لئے پیار کیا تھا؟

کیوں آپ مقدر کو مرے چھوڑ رہے ہیں
مانوس کرم کر کے مجھے چھوڑ رہے ہیں
کیا بات ہے جو عہد وفا توڑ رہے ہیں
کیا آپ نے دو دن کے لئے پیار کیا تھا؟

وہ مان، وہ خاطر، وہ مدارات نہیں ہے
وہ ولولہ، وہ جوشِ ملاقات نہیں ہے
جو پہلے پہل بات تھی وہ بات نہیں ہے
کیا آپ نے دو دن کے لئے پیار کیا تھا؟

وا ہوتی نہیں بہرِ کرم آپ کی باہیں!
کیوں بند ہوئیں لطف و عنایات کی راہیں
یکدم ہی بدل لی ہیں محبت کی نگاہیں

کیا آپ نے دو دن کے لئے پیار کیا تھا ؟

یہ موج تھی، دریا کی کہ جھونکا تھا ہوا کا
کیا پیار کی شدت تھی فقط ایک بگولہ
کس طرح سے یہ جوشِ جنوں ہو گیا ٹھنڈا
کیا آپ نے دو دن کے لئے پیار کیا تھا ؟

اب آپ کو وہ پاسِ محبت بھی نہیں ہے
چاہت بھی نہیں ہے وہ مروّت بھی نہیں ہے
وہ مجھ پہ نوازش، وہ عنایت بھی نہیں ہے
کیا آپ نے دو دن کے لئے پیار کیا تھا ؟

بیگانہ ہوئے جاتے ہو کیوں، غیر سے مل کر
کس جرم کی پاداش میں یہ ظلم ہے مجھ پر
بدلے ہوئے آتے ہیں نظر آپ کے تیور
کیا آپ نے دو دن کے لئے پیار کیا تھا ؟

(شمع نئی دہلی)

نازش پرتاپ گڑھی

اور اب ——— ؟

آج یوں محسوس ہوتا ہے مجھے
درد اپنے میں سموتا ہے مجھے

یہ غمِ دوراں کا پھیلا سلسلہ
کاہشِ جاں قافلہ در قافلہ
لغزشِ پا کو سہارا بھی نہیں
آسماں پر کوئی تارا بھی نہیں
آج تو دل نے پکارا بھی نہیں
سرد ہے قلب و نظر کا حوصلہ
کاہشِ جاں قافلہ در قافلہ

ایک اُجڑے مقبرے کے آس پاس
سنسناتی سی فضا، خوف و ہراس
کوئی جگنو، کوئی مشعل بھی نہیں
دُور تک گردوں پہ بادل بھی نہیں
خواب لیکن جو مکمل بھی نہیں
چپکے چپکے سسکیاں لیتی ہے آس
ایک اجڑے مقبرے کے آس پاس

ٹوٹتا جاتا ہے خوابوں کا بھی جال
میں بنا جاتا ہوں نقشِ پائمال

نور جاتا ہے سیاہی کی طرف
اور اب میرے قدم بڑھنے لگے
ایک انجانی تباہی کی طرف
راستے کے پیچ و خم بڑھنے لگے
مضمحل، درماندہ راہی کی طرف
سازِ غم کے زیر و بم بڑھنے لگے
درد کے خونیں علم بڑھنے لگے

اور اب محسوس ہوتا ہے مجھے!
میری اپنی زندگی سے دُور دُور ا
درد اپنے میں سموتا ہے مجھے
رفتہ رفتہ میرا جاگا شعور
دھیرے دھیرے خود ہی کھوتا ہے مجھے

(صبیح امید کھبتی)

ثاقب کانپوری

واقفِ حسرت و ارمان و تمنا تو نہیں؟
حسن در پردہ کہیں محوِ تماشا تو نہیں؟

میری نظریں مجھے دھوکا تو نہیں دیتی ہیں
سامنے میرے کہیں میرا ہی جلوا تو نہیں؟

خاک اڑاتے ہوئے دیوانے چلے آتے ہیں
یہ چمن زار کہیں دامنِ صحرا تو نہیں؟

بزم میں کیوں ہے یہ دزدیدہ نگاہی تیری
یہ مرے دردِ محبت کا مداوا تو نہیں؟

تو مجھے دیدار کا الزام عبث دیتا ہے
آنکھ اٹھا کر بھی تجھے بزم میں دیکھا تو نہیں؟

جل کے پروانے ہوئے جاتے ہیں کیوں خاکستر
شمع کے پردے میں پنہاں ترا جلوہ تو نہیں؟

ہم نشیں تو ہی بتا تو بھی تو ہے حسن شناس
مری نظروں سے مرا راز وہ سمجھا تو نہیں؟

یہ بتا واعظِ ناداں کہ حقیقت کیا ہے؟
تو جسے دین سمجھتا ہے وہ دنیا تو نہیں؟

کس لئے آج یہ ہنگامۂ غم ہے برپا؟
ترے کوچے میں کہیں ثاقبِ رسوا تو نہیں؟

(پگڈنڈی امرتسر)

ادا جعفری (بدایونی)

بارِ دگر

ذوق کو بہاروں کا پھر سلام آیا ہے
رنگ و بو کی محفل میں میرا نام آیا ہے

بہار پہلے بھی لمحۂ گریزاں نے
میرا حکم مانا تھا، میرے ناز اُٹھائے تھے
...کو خوں کیا میں نے تب نکھار آیا تھا
تب بہار کا موسم شعلہ بار آیا تھا

چراغِ شبنم کا کچھ بجھا بجھا سا ہے
نودمیدہ غنچوں کا رنگ اُڑا اُڑا سا ہے
ئی ہنسی لیکن کچھ رُکی رُکی سی ہے
آنچ آتشِ گُل کی کچھ دبی دبی سی ہے
میں گھٹاؤں کا الجھا سا ہے آنچل
سرخوشی کے اشکوں سے پھیل سا گیا کاجل
آشنا کلیاں کس سے حالِ دل کہتیں
داغ بن گئیں ٹیسیں پھر بھی تو نہ دے پائیں

…نگِ نو کے شعلے مند پڑ گئے کیسے
…زمزموں کے حلقے میں خامشی کے چرچے ہیں

برگ و گل کے ہنگامے سرد پڑ گئے کیسے
دھڑکنیں ہیں خوابیدہ عزم مضمحل سے ہیں

…دھڑکنوں نے بخشی تھی خار و خس کو رعنائی
…بیشمار راتوں کا جب سہاگ اجڑا تھا
…دل کو خوں کیا میں نے تب نکھار آیا تھا
ایک بار پہلے بھی لمحۂ گریزاں نے

امتحاں کی منزل میں آرزو ہی کام آئی!
تب سحر کے ماتھے سے سیلِ نور پھوٹا تھا
تب بہار کا موسم شعلہ بار آیا تھا
میرا حکم مانا تھا میرے ناز اٹھائے تھے

شوق کو بہاروں کا پھر پیام آیا ہے

(نقوش لاہور)

تاج سعید

گیت
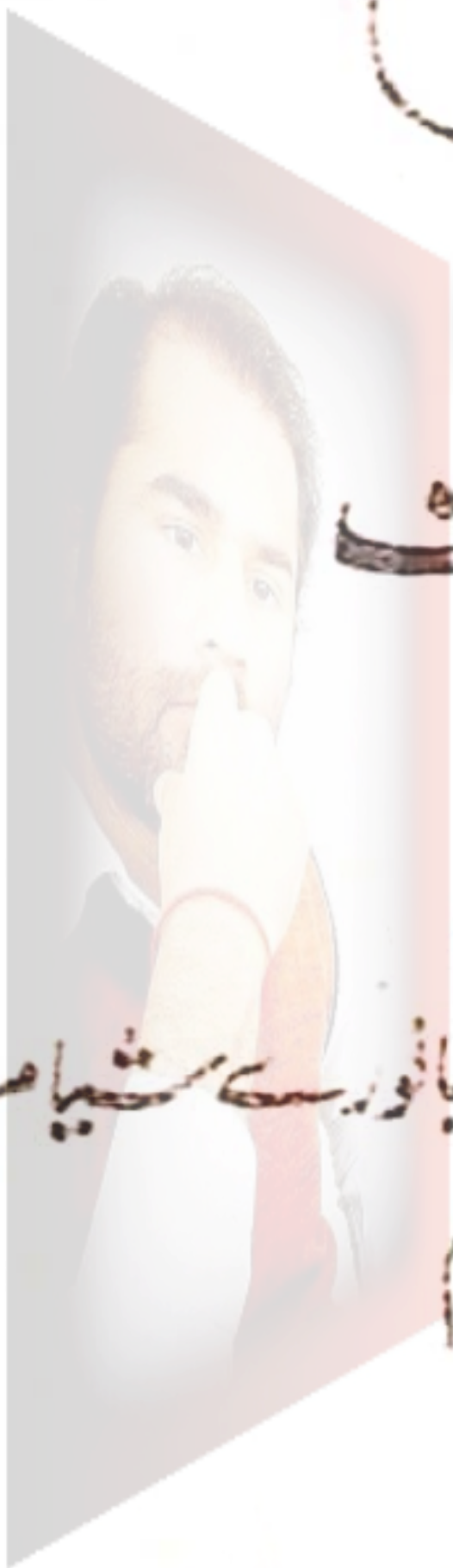
چھپ گئے سانورے شیام
اپنا آپ گنوائیں نیدن نینیاں باورے شیام
چھپ گئے سانورے شیام

بگیا بگیا جا کر جھانکوں
نگر نگر کی دھول کو پھانکوں
کہاں کہاں ڈھونڈوں میں تم کو مجھ دکھیا کے رام
چھپ گئے سانورے شیام
اپنا آپ گنوائیں نیدن نینیاں باورے شیام

جیون ساگر بڑھتا جائے
گیا سمے کب لوٹ کے آئے

کب تک جپتی رہوں گی ساجن تیرا موہن نام
چھپ گئے سانورے شیام
اپنا آپ گنوائیں نس دن نیناں باورے شیام
بگیا میں چھائی ہریالی
جھومے رت بانکی متوالی
تم سنگ پریت لگا کے میں تو ہو گئی رے بدنام
چھپ گئے سانورے شیام
اپنا آپ گنوائیں نس دن نیناں باورے شیام

(کامران سرگودھا)

ڈاکٹر قمر رئیس

○

چلو یہ بھی اپنا ہی جرم ہے، یہ گناہ بھی مرے سر گئے
میں نہ چل سکا تو ٹھہر گیا وہ گذر سکے تو گذر گئے

وہی ساعتیں ہیں فروغِ جاں، مری راہِ شوق میں آج بھی
مری منزلوں کے نصیب جب، ترے نقشِ پا سے سنور گئے

وہی مرحلے مری یاد ہیں، وہی مشغلے مرا خواب ہیں
شب و روز جب، ترے گیسوؤں، ترے عارضوں میں ٹھہر گئے

مجھے اذنِ پرسش ہو تو لبوں پہ ایک سوال ہو
یہی رسمِ شہرِ وفا ہے کیا، مرے ساتھ آپ جو کر گئے

میں جو چپ رہا تو یہ بات تھی کہ کسی کا راز نہ کھل سکے
میں جو رو پڑا تو یہ راز تھا کہ مری وفا سے وہ ڈر گئے

تری زندگی کے فریب نے مجھے شکر ہے یہ بتا دیا
نہ وہ آرزو کبھی جو مٹ گئی نہ وہ حوصلے تھے جو مر گئے

میں کہاں ہوں، ساغرِ مے کہاں، شبِ ماہ کیوں ہے دھواں دھواں
یہ نشہ خمارِ سحر کہیں، مرے عقل و ہوش کدھر گئے

(نگارش، امرتسر)

شان الحق حقی

کیوں پشیماں ہو بہت ہیں مری یادیں مجھ کو
تم سے پیاری تو نہ تھیں دل کی مرادیں مجھ کو

ہوں اسی شرط پہ محفل میں کہ بے ہوش رہوں
ہوش میں آؤں تو محفل سے اٹھا دیں مجھ کو

محرمِ گوش ہوں ہم رشتۂ گوہر نہ سہی
اختیار آپ کا رکھیں کہ گنوا دیں مجھ کو

بس اور آسودگیِ مرگ فقط وہم سا ہے
لذتِ ہجر میں جینے کی دعا دیں مجھ کو

اب وہ لہجہ وہ نظر اور کبھی یاد آتی ہے
تم نے کس دل سے کہا تھا کہ بھلا دیں مجھ کو

شمع ہوں بزم میں لذتِ گریہ کے لئے
اشک آنکھوں سے نہ ٹپکے تو بجھا دیں مجھ کو

ساز بجتے ہیں کہ عالم میں لٹا دیں ترے راز
ورنہ بیتاب کہ پردوں میں چھپا دیں مجھ کو

جن کے صدقے میں ہوا صاحبِ ایماں یارب
وہ سیہ پوش ہی کافر نہ بنا دیں مجھ کو

(نئی قدریں حیدرآباد (سالنامہ))

انور معظم

آفتاب پرست

جلو میں لے کے پریوں کے بے نیازانہ
پھر ایک بار اُفق سے گزر گیا سُورج
اُداس اُداس شفق کی سجی سجائی دُلہن
کرن کرن کے تغافل کی چوٹ کھائے ہوئے
دیارِ شام میں بیٹھی رہی سنگھار کیے
حنائی ہاتھوں میں پرچھائیوں کے ہار لیے
بکھر بکھر گئے کھل کر سیہ سیہ گیسو
مچل مچل گئے جوڑے کے سُرخ سُرخ گلاب
دمک دمک اُٹھے پل پل پلک پلک آنسو

اُداس اُداس شفق کی سجی سجائی دُلہن

ابھی سمجھ بھی نہ پائی تھی درد کی لذت
کہ ایک نرم سی آہٹ فضا میں پھیل گئی
ہر ایک سمت اُجالوں کا لمس دوڑ گیا
ہٹا کے سرد دھندلکوں کا کانپتا گھونگھٹ
کسی کی نور فشاں انگلیوں نے چپکے سے
بکھرتے گیسوئے شب آشنا سنوار دیئے
کسی نے ٹوٹتے آنسو فضا میں تھام لئے
حیا سے بھیگتی حسیں اینوں کو چوم لیا

شفق کو گھیرے ہوئے چاندنی سے باہوں میں
چمکتا چاند ستاروں میں مسکراتا تھا

شفق کی آنکھوں میں جانے وہ کونسی شہ تھی
نہ جانے کون سی راحت کا نور دیکھ لیا
زمیں پہ دور کہیں کوئی آفتاب پرست
کسی دہکتے تغافل کی چوٹ کھایا ہوا
نظر ہٹا کے افق سے، افق سے دور چلا
چلا کہ راحتِ دل کا کہیں جواب ملے
چلا کہ راہ میں اب کوئی ماہتاب ملے

(دلروبا لطیف لاہور)

ساقی فاروقی

کوئی ابر اُڑے

اے دل ترے درد ہیں کس کے لئے، اے دل ترے اشک ہیں کس کے لئے
ہر درد ترا مصرف ہے بے قیمت ہیں ترے سارے دیئے

اسی وحشت میں اسی حسرت میں برسوں اُمید کرا ہی کبھی
میں تھک گیا ہوں کوئی کرتا نہیں ہے زحمتِ چشم براہی بھی

کوئی ابر اُڑے کسی قلزم سے رس برسے مرے ویرانے پر
کوئی جاگتا ہو کوئی کڑھتا ہو مرے دیر سے واپس آنے پر
کوئی سانس بھرے مرے پہلو میں کوئی ہاتھ دھرے مرے شانے پر

اور دبے دبے لہجے میں کہے تم نے اب تک بڑے درد سہے
تم تنہا تنہا جلتے رہے تم تنہا تنہا چلتے رہے

سنو تنہا چلنا کھیل نہیں چلو آؤ میرے ہمراہ چلو
چلو نئے سفر پہ چلتے ہیں چلو مجھے بنا کے گواہ چلو

(ہم قلم کراچی)

سٹار پاکٹ سیریز کے تحت شائع کردہ

شعر و شاعری کی کتابیں

رُوپ - فراق گورکھپوری کی سنگھار رس کی رُباعیوں کا حسین مجمُوعہ!

جلترنگ پاکستان کے مقبول ترین ادبی و فلمی شاعر قتیل شفائی کے "تازہ اور پسندیدہ گیتوں، غزلوں اور نظموں کا مجمُوعہ!

کلامِ مجاز - مجاز لکھنوی کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب!

ابھی تو میں جوان ہوں - عشقیہ و رومانی شاعری کا مجمُوعہ!

رُباعیات - رُباعیات و قطعات کا دلچسپ انتخاب۔

نغمہ نما - فراق گورکھپوری کے منتخب کلام کا مجموعہ!

گاتا جائے بنجارہ ساحر لدھیانوی کے چیدہ نغموں کا مجمُوعہ! اضافہ شدہ نیا ایڈیشن۔

دُور کوئی گائے - شکیل بدایونی کا مجموعہ کلام اُنکی تازہ نظموں کے ساتھ۔

نذرِ بتاں - جاں نثار اختر کے چیدہ کلام کا مجمُوعہ!

کلامِ اختر - اختر شیرانی کا منتخب کلام!

کلامِ ریاضؔ - ریاضؔ خیر آبادی کا منتخب مجموعۂ کلام!

ظفر کی غزلیں - بہادر شاہ ظفر کے کلام کا مجموعہ!

دیوانِ غالب - آفسیٹ پرنٹنگ اور عمدہ کاغذ سے مزین مرزا غالب کا مکمل دیوان!

گل ہائے سب رنگ - مختلف موضوعات کے چیدہ اشعار شعروں کی ڈکشنری!

غزلیں اور نظمیں - اردو کے مشہور و معروف شاعروں کی چیدہ غزلیں اور نظمیں!

ہمیں تو لوٹ لیا - قوالیوں اور نعتوں کا مجموعہ!

رعنائیاں - اس دور کے عظیم فلمی و ادبی شاعر شکیل بدایونی کی شہرۂ آفاق تصنیف "رعنائیاں" - پہلی بار شاد پاکٹ بکس سیریز کے تحت صرف ایک روپیہ میں خوبصورت تصاویر کے ساتھ آفسیٹ پرنٹنگ پر۔

اردو شاعری - ۱۹۶۰ء کی منتخب اردو شاعری - اس دور کے تقریباً سبھی مشہور و مقبول شعراء کا سنہ ۱۹۶۰ء میں شائع شدہ کلام کا انتخاب!

قیمت فی کتاب - ایک روپیہ

ملنے کا پتہ :-

پنجابی پستک بھنڈار - دریبہ کلاں دہلی ۶

کی اُردو شاعری
اُردو کے مشہور و معروف شعراء کی سنہ ۶۶ء میں
ع ہوئی شاعری کا یہ انتخاب بڑا رنگا رنگ ہے۔ اسمیں
یں بھی ہیں، نظمیں بھی، قطعات بھی ہیں اور گیت بھی۔
ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب سے
اری کے ذوق و پسند کی تکمیل ہو جائے ۔۔
ید ہے کہ اصحابِ ذوق اس کی
بانِ شان پذیرائی کرینگے۔